دینِ الٰہی اور اُس کا پس منظر

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

دینِ الٰہی اور اُس کا پس منظر

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان دہلی

Deen-e-Ilahi Aur Uska Pas Manzar
by
Mehar Mohd Khan Shahab Maliyar Kotlavi

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/66 روپے

ISBN : 978-81-7587-802-0 سلسلہ مطبوعات: 1634

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی 110020

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
منیجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

پیش لفظ

سلطنت مغلیہ کے عظیم بادشاہ اکبرؔ کی شخصیت و عقاید سے متعلق جو کچھ قدیم و جدید تحریریں میں نے پڑھی ہیں اُن میں سے اکثر میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ہمارے اپنے خیالات و عقاید ایسے ہیں جو ایک معروضی نقطۂ نظر کے لیے روک بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اورنگ زیب کی شخصیت اور کارنامے ہمارے افراط و تفریط کے رویّے سے مجروح ہوتے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ہند۔ بنگلہ۔ پاک برصغیر میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک اکبرؔ کی طرفدار اور دوسری اورنگ زیب کی، اور اس طرفداری میں 'سخن فہمی' اور اس کے تقاضے نظرانداز ہوتے رہے۔ اکبرؔ کے خلاف سب سے زیادہ غلط فہمی ملّا عبدالقادر بدایونی کی بے لچک تنگ 'نظری' کی وجہ سے پھیلی، اس میں اس طبیعت کو بھی دخل تھا جو آرتھوڈوکسی کے بنائے سانچے میں ڈھلی تھی اور جس میں دوسروں کے نقطۂ نظر اور کردار و گفتار کو معروضیت کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

اکبؔر اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن بے حد ذہین تھا اور خالق کائنات کی طرف سے تلاش و تفحص کی بے پناہ صلاحیت اس کی طبیعت کو ودیعت کی گئی تھی۔ اس کی بے چین طبیعت ہر معاملے میں حقیقت کی متلاشی رہتی تھی، مذہب سے متعلق بھی وہ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن اس سلسلے میں اُس زمانے کے علمار سے اسے کوئی مدد نہیں ملی، بلکہ وہ اُلٹا علمار سے اُن کی تنگ نظری اور روحانی خوبیوں کے معاملے میں اُن کی بے بضاعتی کے سبب، بہت زیادہ بدظن ہوگیا۔'عبادت خانے' میں اس نے علمار کو جس رنگ میں دیکھا' اس کی وجہ سے وہ ان سے مایوس اور دور ہوتا گیا اور "دوزخ و جنت کے ان کلید برداروں کے تنگ حلقے سے نکل کر عالم ادیان کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔"

اکبؔر عقیدتاً نہ تو کبھی مرتد ہوا اور نہ ملحد، ہاں اس کے بعض اعمال پر شرعی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا جاسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں کون ایسا سلطان اور بادشاہ (اِلّاماشأاللّٰہ) گزرا ہے جس کے اعمال سونی صدی شریعت کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہوں۔ اکبؔر اس لحاظ سے واقعی بہت مظلوم ہے کہ ادبی چابک دستیوں کے سہارے بدایونی نے ایسے بیسیوں احکام شمار اور اکبؔر سے منسوب کر دیے ہیں جو کبھی جاری نہیں ہوئے اور جو احکام جاری ہوئے ان کو اس نے توڑ مروڑ کر ایک خاص نقطۂ نظر کی تائید میں

پیش کر دیا۔ بعد میں لوگوں نے اسی بنیاد پر اس کو سبّ و شتم کا نشانہ بنایا۔

مولانا مہر محمد خاں شہاب نے جو ایک کہنہ مشق صاحب قلم، محقق اور متوازن نقطۂ نظر کے اہل ہیں، اپنے اس مقالے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے استاد تاریخ پروفیسر محمد اسلم صاحب کی کتاب 'دین الٰہی' پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور اس سلسلے میں بدآیونی کے بیانات، اکبر، شیخ مبارک، فیضی اور ابو الفضل کے بعض خیالات اور حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کے موقف پر بڑی صراحت سے لکھا ہے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں جدید تحقیقی خصوصیت کے ساتھ اُس سچے مذہبی رجحان کی ترجمانی ہے جس سے زندگی میں معنویت اور مقصدیت پیدا ہوتی ہے اور یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی خدمت درحقیقت خدا کی عبادت ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی
پرنسپل جامعہ کالج۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی

پہلے اسے پڑھیے

یہ کتابچہ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ میرا وہ مضمون ہے جو رسالہ "جامعہ" دہلی کی جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۳ء کی مسلسل چار اشاعتوں میں شایع ہوا تھا۔ اس میں کیا ہے اور کیوں لکھا گیا؟ اگرچہ اس کا جواب آیندہ صفحات میں مفصّل موجود ہے۔ تاہم بطور تمہید اتنا اور عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ المشایخ علاّمہ مبارک و حکیم ابوالفیض فیضی فیّاضی و علامی شیخ ابوالفضل اور اکبر اعظم و اکرم رحمہم اللہ کی بدنامی میں بدایونی ملاّ عبدالقادر قادری صاحب منتخب التواریخ مرحوم (خدا ان کی اور ہماری کمزوریاں اور نادانیاں معاف فرمائے) کے دو زبان۔ پردہ نشین قلم نے جو کام کیا ہے۔ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ملاّ صاحب دو رخی باتیں کرتے ہیں۔ شہد میں زہر گھولتے ہیں اور تسمیہ اسے حق و صداقت عسلِ مصفیٰ بتاتے اور تریاق خالص جتاتے ہیں۔ اور اس امر میں اس قدر چابک دست

ہیں کہ بہت سے روایت پرست خوش گمان اہلِ قلم ان کے ہم زبان ہو گئے۔ مگر تا بہ کے۔ آخر وقت آیا اور تاریکی چھٹنے لگی اور بعد میں آنے والے اہلِ قلم نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ بدایونی مرحوم نے خاندانِ مبارک سے انصاف سے کام نہیں لیا۔ مثلاً مولانا شبلؔی اور مولانا آزاد دہلوی مرحومین وغیرہ نے اس بارۂ خاص میں ملّا بدایونی کی زیادتیوں کا اعتراف کیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی عصر حاضر کے اہلِ نظر نے زیادہ گہرائی سے ملّا بدایونی مرحوم کے بیانات کو پرکھنا شروع کیا۔ ایسے اصحابِ قلم میں شیخ محمد اکرام مرحوم کی تعمیری تنقید و تبصرہ کو شانِ امتیاز حاصل ہے۔ آیندہ اوراق میں راقم الحروف نے انہی پیشرو محترم افاضل اہلِ قلم کے اندازِ فکر و نظر کی پیروی میں ملّا بدایونی مرحوم کے اصل بیانات کو مکرر توجہ سے دیکھا تو نئے نئے حقایق و لطائف بے حجاب سامنے آنے لگے جو اربابِ نظر کے حضور حاضر ہیں۔

بزرگانِ سلف و خلف سے سوءِ ظن کے آزار سے خدا محفوظ رکھے۔ ہیچدان راقم جو "غیروں" کے حق میں سوءِ ظن یا بے ادبی کو پسند نہیں کرتا۔ کیسے ممکن ہے کہ "اپنوں" کے بارے میں بے ادبی سے کام لے۔ اگرچہ صحیح یہ ہے کہ یہ انسانی کمزوری عام ہے کہ "اپنوں" کی کمزوریاں محاسن اور غیروں کے "محاسن" معایب خیال کر لیے جاتا

روزمرہ کا معمولی مشاہدہ ہے۔ اس کے برخلاف حقی الوسع راقم کا اعتقاد ہے کہ جب "بام" ایک ہے تو "ہوا" بھی ایک ہی ہوگی۔ کیونکہ یہ تسلیم کرلینا ضمیر پر بارگراں ہے کہ "بام ایک" اور "ہوائیں دو"۔ بہرحال صورتِ حال یہ ہے کہ "نیک نام اور بدنام" ہستیاں۔ خالقِ کائنات۔ ربّ العالمین ارحم الراحمین کے حضور میں حاضر ہیں۔ آج نہیں تو کل ہمیں بھی اسی دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اسی دربار سے لاریب عدل وانصاف کی توقع تو ہے ہی۔ رحم وکرم اور بندہ نوازی کی بھی امید ہے۔ وھو الغفور الرحیم

۲۶ر نومبر (دوشنبہ) ۱۹۷۳ء　　　مہر محمد خان شہاب

۳/۱۴ بی۔آئی۔ٹی۔ بلاکس

ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

"دین[1] الٰہی اور اُس کی تقریظ"

عنوانِ بالا سے ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے استاذ شعبہ تاریخ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب فاضل جامعاتِ پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر، کیمبرج نے تصنیف فرمائی اور منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی کے اہتمام سے پہلی اگست ۱۹۶۹ء کو علامہ عصر استاد العلماء مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی و مدیر شہیر ماہنامہ برہان دہلی کی تقریظ کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔

تقریظِ کتاب میں حضرت علامہ اکبرآبادی مدظلہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> بعض خوش فہم حضرات ایسے بھی ہیں جو "دین[1] الٰہی" کو
> ہندوستان میں متحدہ قومیت پیدا کرنے کی ایک کوشش
> سمجھتے ہیں اور اس لیے اسے اپنے خیال کے مطابق مستحسن
> قرار دیتے ہیں۔ (دین الٰہی ص)

---

[1] اکبر کی وفات سے کوئی ساٹھ ستّر سال بعد "دین الٰہی" کی ترکیب شاید پہلی مرتبہ "دبستانِ مذاہب" میں استعمال ہوئی ہے ورنہ اکبر، ابوالفضل حتیٰ کہ ملّا بدایونی بھی ربّی۔ ارادت وغیرہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ (رود کوثر طبع چہارم ص۱۲۳ بحوالہ منتخب التواریخ جلد دوم ص۳۰۴)

اسی سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس (کتاب) میں بہت سے ایسے مآخذ سے مدد لی گئی ہے جو اب تک ارباب نظر سے پوشیدہ تھے۔ اور (مصنف نے) جو کچھ لکھا ہے منطقی تسلسل اور ربط کے ساتھ لکھا ہے۔ عزیز موصوف (پروفیسر محمد اسلم مصنف کتاب دین الہٰی) کا نظریہ عہد زیر بحث کی تاریخ میں ایک بالکل نیا اور انقلاب آفریں نظریہ ہے..... پس منظر معلوم ہوجانے کے بعد حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت اور عظمت بھی دوچند ہوجاتی ہے۔"

جب علامہ اکبرآبادی کے ان الفاظ نے کتاب کی اہمیت پر صاد کردیا تو خیال ہوا کہ یہ الفاظ کسی معمولی شخص کے قلم سے نہیں نکلے بلکہ اس وسیع النظر عالم کی تحریر ہیں جو مشرقی اور مغربی علوم کے دریا کا نام آور شناور ہے اور جس نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت کے رکن رکین مولوی مسعود عالم ندوی مرحوم کی تنگ نظرانہ اس تنقید کا جواب لکھا تھا جو آں مرحوم نے مجاہد حریت داعی انقلاب سندالعلما رئیس الاحرار مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ومغفور کے خیالات وتعلیمات کے رد میں لکھی تھی۔ کتاب کے نام "دین الہٰی" اور اس کی تقریظ سے متاثر ہوکر ذوق وشوق سے کتاب پڑھی مگر پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ گو پروفیسر محمد اسلم صاحب نے ماخذوں میں کم وبیش عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں کی ایک سو سولہ کتابوں کی فہرست دی ہے۔ لیکن اکبر اور اس کے معروف درباریوں کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد

ملّا عبدالقادر بدایونی مرحوم کی کتاب منتخب التواریخ پڑھی ہے۔ یا بعض مناظرانہ مباحث اور سیاسی اغراض سے لکھی گئی قلمکاری کے نمونے ہیں جن میں فقہی اختلافات کی نمائش یا تو تو میں میں قسم کی باتیں ہیں۔ خلاصہ ساری بحث کا یہ ہے کہ اکبر نعوذ باللہ مرتد تھا اور ابوالفضل، فیضی مرحومین بے دین، ملحد اور ان دونوں کے والد شیخ مبارک مرحوم شیعہ تھے۔

یہ مضمون جو چند قسطوں میں شائع ہوگا ساری کتاب کا جواب نہیں بلکہ ملّا صاحب بدایونی اور اُن کے وکیل اور شارح یا نمایندہ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کے بیانات و تصریحات پر تنقید۔ اور اکبر و شیخ مبارک فیضی و ابوالفضل کے دین و دیانت کا بیان ہے اور حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے موقف پر تبصرہ۔

مقصد تالیف کتاب دین الٰہی

حضرت علامہ اکبر آبادی کی تقریظ کے بعد کتاب کا "پیش لفظ" ہے۔ اس میں پروفیسر محمد اسلم صاحب فرماتے ہیں:

"جہاں تک اکبر اور اس کے دین الٰہی کا تعلق ہے مجھے اس کی ذات یا اس کے خانہ ساز دین سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اکبر اور دین الٰہی کا مطالعہ صرف مجدد الف ثانی کی تحریک کو سمجھنے کی خاطر کیا ہے۔ ان کی تحریک چونکہ اکبر کی مذہبی حکمت عملی کا ردعمل ہے اس لیے ان کی تحریک کو کماحقہ سمجھنے کے لیے اکبر کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔"

فیضی اور ابوالفضل کے والد بزرگوار شیخ مبارک کے تذکرے میں "مناظرانہ" طرز نگارش اختیار کرنے کی معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ مناظرہ میرا فن یا
پیشہ نہیں۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر محض علمی
اور تحقیقی کتاب ہے (صنا) اس لیے میں نے
بے جا مذہبی بحث سے احتراز کیا ہے"

اور شیخ مبارک کے مذہب و مسلک پر ہمارے فاضل مصنف نے اپنا فیصلہ ان لفظوں میں صادر کیا ہے کہ:

"شیخ مبارک میری (پروفیسر محمد اسلم) تحقیق
کے مطابق زیدی شیعہ تھا" (صنا)

"پیش لفظ" سے آگے بڑھیے تو اصل کتاب کا "آغازِ سخن" ان لفظوں سے ہوتا ہے کہ:

"شمس سراج عفیف کی روایت ہے کہ ایک
روز سلطان فیروز تغلق حرم کے قریب ایک
مجذوب الحال درویش جمنا کے کنارے وضو کر رہا
تھا۔ جب وہ وضو سے فارغ ہوا تو اس نے شاہی محل
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو کیا جانتا
ہے کہ اس محل کے اندر کون ہے؟ پھر اس نے
خود ہی کہا کہ اس محل میں جو شخص مقیم ہے اس نے
دنیا بھر کے فتنے اپنے پاؤں تلے دبا رکھے ہیں۔
جس دن وہ اس جہاں سے اٹھ جائے گا اس دن

دنیا والوں کو اس کی قدر معلوم ہو جائے گی۔"

(دین الٰہی ۲۵)

اللہ اللہ! یا تو ایک مجذوب الحال درویش سے عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ان کے مجذوبانہ کلام سے اپنی کتاب کا آغاز فرماتے ہیں یا آگے چل کر مجذوب کے بھائی مجاذیب ہی کو اپنے اعتراضات کے تیروں کا پہلا آماجگاہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"وحدت الوجود کا نظریہ عام ہوتے ہی جہاں ملک کے کئی گوشوں سے انا الحق کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ وہیں بعض صوفیہ کو ہر حجر و شجر میں ذاتِ حق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ اس دور میں صحو و تمکین کی

لہ۔ تعجب ہے کہ محترم پروفیسر صاحب کو اس دور کے ہنر بھی عیب نظر آرہے ہیں۔ براہ کرم سطور ذیل پر غور فرمائیں:

الف۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۵۱ ۱۷/۴۴

ب۔ سعدی ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

ج۔ سعدی ؎

بذکرش ہر چہ بینی در خروش است دلی داند دریں معنی کہ گوش است

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوانیست کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانیست

(باقی اگلے صفحے پر)

جگہ سکر و مستی نے لے لی اور ہر شہر اور قصبے
میں ننگ دھڑنگ مجذوب نظر آنے لگے۔ ماہرین عمرانیات
کا خیال ہے کہ کسی معاشرے میں مجاذیب کی بھرمار
اس کے غیر صحت مند ہونے کی نشان دہی کرتی ہے
اُس دور میں اُن مجذوبوں نے ہندوستان کے معاشرے
میں بڑا منفی کردار ادا کیا ہے۔" (صـ۲۸)

(سلسلہ گذشتہ صفحہ)

د ۔ حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا عبدالرحیم رائے پوری کے قیام گاہ کے باغ اور پاس بہتی ندی کے ذکر میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم فرماتے ہیں کہ: آپ (مولانا عبدالرحیم) حضرت امولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفا میں تھے اور غلبہ کتمان و اخلاص کی وجہ سے نقشبندیت (یعنی مشرب حضرت مجدد سرہندی۔ شہاب) کا آپ پر غلبہ تھا کہ باغ کے پتے پتے اور نہر کے قطرے قطرے سے ذکر اللہ سنائی دیتا اور اسی لیے جس شخص بھی حاضر خدمت ہوکر اس اندرونی لذت کو محسوس کرتا تھا جس میں آپ کا اور آپ کے متوسلین کا ہر لمحہ گزرا کرتا تھا۔ تذکرۃ الخلیل طبع دوم صـ۲۳۴ پھر اسی کتاب کے صـ۲۶۴ پر مرقوم ہے کہ،

ه ۔ آپ (مولانا عبدالرحیم رائے پوری مرحوم) منصب ارشاد و ہدایت کے تاجدار تھے کہ درخت کا پتہ پتہ اور نہر کا قطرہ قطرہ حاضرین کو ذکر اللہ کا سبق پڑھایا کرتا تھا۔" ؏

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما — شہاب

ہمارے بعض بُزرگ

مجھے یقین ہے کہ ہمارے فاضل محترم مورخ پروفیسر محمد اسلم صاحب ضرور باخبر ہوں گے کہ ہمارے ہندوستان کے مشہور مراکز علوم دین کے علمائے شریعت کو ایسے ایسے "مجاذیب" سے والہانہ عقیدت رہی ہے جن میں سے کوئی بزرگ ظواہر عبادات کے مطلق پابند نہ تھے اور ظاہری علم سے بھی بظاہر بے خبر تھے اور بعض ایسے مجذوب بزرگوار تھے کہ عبادات ظاہری کی پابندی اور علم ظاہری سے بہرہ رکھنے کی شہرت کے ساتھ حقہ پینے کے اس شدت سے شایق و عادی تھے کہ ان کے ارادت کیش ان کے لیے تمبا کو بطور ہدیہ پیش کرنے کو دوسرے ہدایا پر ترجیح دیتے تھے۔ اور بعض مخلص مرید بشدت حقہ پینے کو اپنے مرشد باصفا کی گویا سنت کا درجہ دیتے تھے۔ حالانکہ علمائے شرع میں تمباکو نوشی کی حلت و حرمت کا مسئلہ بھی زیر بحث رہا ہے۔ اور قریب ہی کے زمانے میں ایک صاحب سلسلہ بزرگ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کے جذبۂ سکر و مستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے خدام باربار ان کو چادر اُڑھا دیا کرتے تھے مگر خود انھیں کسی چیز کا خیال نہ تھا اور ان کی طرف رجوع خلق کی یہ کیفیت تھی کہ عوام نہیں خواص ان کے نام کے نعرے لگاتے تھے۔ اور فقرا ہی نہیں کتاب و سنّت کی اساس پر قائم ہونے والے بعض بیرونی ملکوں کے سربراہ ان کے مزار پُر انوار کے اطراف کے لیے صعوباتِ سفر برداشت کر کے حاضری دیتے تھے اور اسی طرح ایک اور بزرگ کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ حضرت موصوف سلاسل چہارگانہ کے مرشدِ مجاز اور ایسے صاحبِ کرامات بزرگوار

تھے کہ منازل سلوک و عرفان میں بڑے بڑے صاحبانِ افتار و اجتہاد کی دستگیری فرمایا کرتے تھے۔ لیکن علم ظاہر کے لحاظ سے ان کے بعض خلفاً ان سے بعض فقہی مسائل میں کھلم کھلاّ اختلاف رکھتے تھے۔ گویا ان علمار کی نظر "ہدایہ" پر اور عقیدت کی پیشانی اپنے کم سواد بزرگ کے قدموں پر رہا کرتی تھی۔

اسلامی ممالک میں روحانی و عرفانی مقامات عالیہ پر فائز ہونے کے مدعیوں کی کمی نہیں ہر دور کے بزرگ مدعیوں کو ان کے معاصروں نے مخالف و موافق بہت کچھ کہا ہے اور تو اور ہمارے شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الفِ ثانیؒ نے اپنے وقت میں اپنا روحانی مقام خلت اتنا بلند بتایا تھا جو گویا مقام رسالت سے کم نہ تھا (رود کوثر ص۲۹۳ بحوالہ جلد سوم مکتوب نود و ہفتم) یا آپ کا رتبہ صدیق اکبرؓ سے اونچا ہے۔ اس دعویٰ سے ہم عصر علماء میں ایک تہلکہ مچ گیا حتیٰ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ تب حضرت مجدد نے اپنے پہلے ارشاد کی تاویل فرمائی۔ غرض جو کچھ بھی تھا یا ہے اس کے لیے تاویل کی ضرورت ہے۔

ہمارے نوجوان فاضل مصنّف ہندوستان کے اس دور کی مختلف الخیال لوگوں کی مذہبی وسعتِ مشرب یا روش کی تصویر طنزاً یا معترضاً انداز میں ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں کہ:

> "ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاط سے ایک نئے معاشرے نے جنم لیا۔ جس میں برہمن قرآن حکیم اور اسرارِ توحید کا درس دینے لگے اور مسلمان ہندوؤں کے علوم کی تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ہندو

مسلم بھائی بھائی کے نظریے کو اسی دور میں فروغ
ہوا۔ اس نظریے کے حامیوں نے اس بات کا بڑی
شدومد کے ساتھ پرچار کیا کہ کفر و اسلام ایک ہی
دریا کے دھارے ہیں جو آگے جاکر ایک دوسرے
میں مل جاتے ہیں۔ نواہونؔ کی صدا اور

لہ نواہون کی صدا اور بودھن کا نعرہ

مسمیٰ "نواہون" سلطان فیروز تغلق دہلی کے عہد کا ایک ہندو تحصیلدار تھا (آب کوثر طبع پنجم ص۲۵۸) اور "بودھن" سلطان سکندر لودھی کے زمانے کا ایک عالم و عارف برہمن تھا (آب کوثر طبع پنجم ص۴۵۶) اول الذکر مخدوم جہانیاں کی علالت میں مزاج پرسی کے لیے آیا اور باتوں باتوں میں بولا جیسے خدا نے رسول عربی کو ختم الانبیاء بنایا ویسے ہی مخدوم جہانیاں ختم الاولیاء ہیں۔ مخدوم کے بھائی راجو قتال نے جو ایک گرم مزاج انسان تھے "نواہون" سے کہا کہ مسلمان ہوجاؤ، اس نے انکار کیا، راجو نے اصرار کیا۔ نواہون فریاد لے کر دلّی پہنچا۔ فیروز تغلق حال سن کر اس کی جان بچانا چاہتا تھا۔ بعض اہل بصیرت علماء نے شاہ کی تائید کی کہ نواہون مسلمان تھا ہی نہیں جو اسے ارتداد کی سزا دی جائے (اور صرف ارتداد کی سزا قتل قرآن کے خلاف ہے۔ کیوں کہ دین میں جبر نہیں) جیسے انسان قبول میں مختار ہے انکار میں بھی مختار ہے۔ شہاب) مگر راجو قتال کو طیش آگیا اور نواہون کو طلب کیا، حالات سے مجبور ہوکر نواہون کو راجو قتال کے سپرد کیا گیا اور انھوں نے اپنی ہٹ پوری کرلی۔ اور پنڈت بودھن جو اسلام اور ویدک دھرم کو اصولاً

(باقی اگلے صفحے پر)

لودھن[۱] کا نعرہ اسی نظریے کی ترجمانی کرتے ہیں۔"
(دین الٰہی ص۲۹)

اکبری دور

اگرچہ محترم پروفیسر صاحب کو یہ دور قابلِ اعتراض نظر آتا ہے مگر میرے نزدیک یہ دور بہت مبارک دور تھا۔ غالباً اقبال کے ذہن میں یہی دور تھا جس کی یاد نے اس سے یہ شعر کہلوایا تھا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(سلسلہ گذشتہ صفحہ) ایک کہتے تھے کہا گیا کہ ایک کو مانو دوسرے کا انکار کرو۔ پنڈت جی اپنی بات پر قائم رہے، بات سکندر لودھی کی مجلس تک پہنچی، وہاں اس وقت ملک العلماء عبداللہ کی شان اور نظر کا کوئی عالم تھا نہیں، محضر تیار ہوا۔ عام فتویٰ یہ تھا کہ بودھن ایک کا انکار کرے، ادھر یہی قول تھا کہ دونوں سچے۔ نتیجہ اس حق پر قائم رہنے کا موت تھی (مفہوم بالفاظ شہاب) "نواہون" کی صدا اور "بودھن" کے نعرے میں جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کا اسی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ حق یہی ہے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے ویدک دھرم، عیسائی اور یہودی وغیرہ مذاہب اصلاً حق ہیں جیسے اصلاً اسلام حق ہے بعد کی غلطیوں کی بنا پر اصل کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسروں کو جھٹلانے والے اپنے اردگرد نظر کیوں نہیں ڈالتے۔

[۱] لودھن نہیں "بودھن"

اقبالؔ کا یہ شعر ہمیں اچنبھے میں کیوں ڈالتا ہے؟ اس لیے کہ دور زیر بحث میں ہندو مسلم خیالات میں انہام وتفہیم سے جو ایک ذہنی و سماجی قرب پیدا ہو رہا تھا اور غیریت و اجنبیت کے پردے درمیان سے اُٹھنے لگے تھے۔ ہندوستد اور عرب وعجم اور شرق وغرب کی مکانی ولسانی دوری اور بیگانگی نے مطالب و حقائق کو تہ بر تہ، پردہ در پردہ، خول در خول مستور کر رکھا تھا۔ اکبری عبادت خانے کی متقابلانہ گفت وشنید نے غرابت و اجنبیت کے قشور کو دور کر کے ایک قسم کی معنوی ہمدردانہ نزدیکی میں بدل دیا تھا لیکن بعد میں سیاسی اور جذباتی وجوہ اور من وتو کی غیریت آفریں بحثوں نے ان میں جو عالم خیال وجذبات میں قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، منزلوں کی دوری پیدا کر دی تھی جس دوری کو محسوس کر کے اقبال عالم خیال میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

قرآن حکیم جس کا مخاطب صرف خطۂ عرب ہی نہیں بلکہ سارا عالم تھا اور ہے، کیا یہ خوشی کی بات نہ تھی کہ اُس دور میں قرآنِ عربی کے اسرار ہندوستان کے برہمن بیان کرنے لگے تھے اور ہندوستان کی مقدس آسمانی کتابیں جن کا مطالعہ پراچین کال میں بیرونیوں ہی کے لیے نہیں، ہندو پیدا ہونے والے بعض طبقوں کے لیے بھی شجرِ ممنوعہ اور ان کی تلاوت یا صرف سماعت قابلِ تعزیر جرم سمجھا جاتا تھا— اس دور میں مسلمان علمار و فضلار کے مطالعے میں رہنے لگی تھیں۔ دورِ غزنوی میں صرف ایک عالم البیرونی کو یہ سعادت حاصل ہوئی تھی مگر اس دور میں بہت سے مسلم علمار اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے مخاطبوں کو ان قدیم مقدس صحیفوں کے پُرحکمت ارشادات سے مستفیض ومستفید کر سکیں۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ کئی

حقیقتوں کے پیش نظر ایک سچا اور مخلصانہ نعرہ تھا۔ اس کے خلاف آواز ہی نے بڑھتے بڑھتے ہندوستان میں دو قومی نظریے کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی پیداوار کتاب وسنت کی اساس پر قائم ہونے والی نام نہاد "پاکستان" نام کی "اسلامی حکومت" ہے، جس کی اسلامیت کا نظارہ ۲۵ برس سے ہمارے سامنے ہے اور ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اگر اسلامیت یہی ہے جس کا نمونہ گذشتہ سال (۱۹۷۱ء) "اسلام آباد" کے خداوندوں اور اُن کے مسلح سورماؤں نے مشرقی بنگال میں دکھایا تو ؎

ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

کفر و اسلام

یقیناً "کفر و اسلام" "کفر و اسلام" ہی ہیں مگر ہمارے فاضل مؤرخ نے غور نہیں فرمایا۔ ہندو دھرم جسے وہ تعریضاً "کفر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ کسی ازلی ابدی صداقت کا کفر یا بالفاظ دیگر انکار نہ تھا اور نہ ہے، بلکہ وہ قدیم بھارت میں ظہور حق ہی کی ایک شکل تھی کیونکہ یہ خداوند عالم رب العالمین کی ازلی وابدی سنت کے مطابق ہندوستان میں مبعوث ہونے والے خدائی رسولوں اور پیغامبروں کی لائی ہوئی صداقتوں پر "ایمان" ہے، یہ کفر وہ بدنام "کفر" نہیں جو کسی صداقت کے انکار کا نام ہے۔ بلکہ یہ "کفر" قدیم صداقت تھا جو قرآنی زبان میں "اسلام" ہی کہلاتی ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری یا اس کی طرف سے کم توجہی کی وجہ سے ان دونوں لفظوں کو دو رنگ کی عینک سے دیکھا گیا ہے جن لوگوں نے "دین اسلام" کی ابتدا ملک عرب سے چودہ سو سال پہلے بلند ہونے والی آسمانی آواز

تک ہی محدود سمجھ رکھی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے ہندوستان میں بلند ہونے والی روحانی الہامی آسمانی یا خدائی آوازوں کو اپنی بے خبری سے کفر کا نام دے دیا تھا۔ اس لیے یہاں ازلی ابدی "اسلام" کے لیے کفر کا لفظ اسی طرح مخالف کی مزعومہ غلط فہمی ثابت کرتا ہے، جس طرح امیر خسرو مخالفوں کے علی الرغم اپنے مشربِ حق کو ع

من قبلہ راست کردم بر سمتِ کج کلاہی

"بت پرستی" کہتا ہے ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری می کنم با خلق و عالم کار نیست

اور حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان یا بھارت میں خدا کے نبیوں اور پیغمبروں کا وقتاً فوقتاً ظہور ہوتا رہا ہے۔ اور یہ ایک ناقابلِ شک و ریب صداقت ہے۔ بھگوت گیتا میں اعلان کیا گیا ہے ؎

بچو بنیادِ دیں سست گردد بسی
نمایم خود را بشکل کسی

(ترجمہ ملک الشعرا فیضی)

اور اس صداقت کو جن بلند و بالا بزرگوں نے تسلیم کیا ہے ان میں سے ایک حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات والا صفات ہے۔ (مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم ص۳۰۷ مطبوعہ مطبع مجددی امرت سر) جن کی تحریک کو سمجھنے کے لیے ہمارے فاضل پروفیسر صاحب نے اس کتاب کے لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ پھر اس حقیقت کا اعلان حضرت مجدد کے مکتوبات تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آپ کے سلسلہ عالیہ کے

نمایندہ معروف حضرت مرزا جانِ جاناں شہید کے کلمات طیبات میں بھی
اسی حقیقت کو مکتوبات سے زیادہ صراحت وصفائی سے بیان کیا گیا ہے،
مگر دلی دُکھ کی بات ہے کہ فاضل مصنفِ "دینِ الٰہی" نے اسی نکتے کی طرف
توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہند میں ظہورِ انبیاء کے قائل ہونے کے
باوجود حضرت مجدد ہندوؤں کو اہلِ کتاب کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ یہ
آنجناب کی اجتہادی رائے اور سیاسی مجبوری ہے۔ اور اس رائے کے اظہار
میں اتنی شدت ہے کہ ان کو یہ تک گوارا نہیں کہ کوئی باوجاہت ذی اثر
مسلمان کسی معزز غیر مسلم بھارتی کی واجبی تعظیم کرے یا غیر مسلموں کو کوئی مسلمان
رئیس اپنی ریاست میں کوئی بڑا عہدہ دے۔ ان کی اس رائے کی بنیاد اس عقیدے
پر بھی کہ ملک میں بسنے والی دو قومیں ہیں مسلم اور غیر مسلم۔ مسلم حاکم، غیر مسلم محکوم
اور محکوم حاکم کے برابر ہو ہی نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ کہ مسلم کو غیر مسلم پر مذہبی
تفوق بھی حاصل ہے اور سیاسی برتری بھی۔ اس لیے دونوں کے حقوق
و مدارج مساوی نہیں ہو سکتے (مفہوم رود کوثر صہ ۳۱۹ - ۳۲۰) ہمارے
نزدیک یہ نظریہ صحیح نہیں۔ کیونکہ آسمانی انعامات وعطیات میں جس طرح سب
انسان برابر ہیں، اسی طرح زمینی بادشاہی میں بھی سبھی انسانوں کے
شہریت کے حقوق مساوی ہونا ہی چاہییں۔ اکبری دور کی سیاست ریاست
اور مذہبی طریق فکر کا یہی انداز تھا۔

ملّا بدایونی کے حلفیہ بیان کی حقیقت

اگرچہ کتاب "دین الٰہی" کے فاضل مصنف کا اپنے بارے میں قول
تو یہی ہے کہ وہ مذہبی مناظر نہیں صرف ایک مورّخ ہیں۔ لیکن ان کی

کتاب کے مطالعے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ سراسر اس کے خلاف ہے۔ مثلاً ان کا اکبر کے "مرتد" ہونے پر اصرار، مرحوم شیخ مبارک کے "زیدی شیعہ" ہونے پر اصرار، یا فیضی اور ابوالفضل (مرحومین) کے بے دین اور ملحد ہونے پر اصرار۔ یہ باتیں تنگ نظر، کج بحث، خود بین کٹھ ملاؤں کی پیروی ہے نہ کہ کسی بلند نظر، وسیع القلب، دینی بصیرت رکھنے والے عالم اور دینی ذکر و فکر میں محتاط اور عاقبت اندیش صاحب قلم محقق کی روشِ تحقیق و تنقید۔

موصوف کے مورّخ اور استاد تاریخ ہونے کا یہ رنگ ہے کہ آپ کا سب سے بڑا ماخذ تاریخ مرحوم ملا عبدالقادر بدایونی ہے، اور ملا بدایونی پر بھروسہ اس لیے نہیں کہ ہمارے جواں سال فاضل مصنف نے ملا صاحب کے بیانات کو ایک محقق مدقق کی طرح روایت و درایت کے ہر ممکن و معقول پہلو سے جانچ اور پرکھ لیا ہے بلکہ آپ اُن کے بیانات و روایات پر محض اس لیے ایمان لے آئے ہیں کہ ملا موصوف نے قسم کھا کر کہا ہے کہ:

"مقصود ازیں نوشتن غیر از دردِ دین و دلسوزی بر ملت مرحومۂ اسلام ... چیزی دیگر نبود و نیست و از تعنت و حقد و تعصب بخدا پناہ می جویم۔"

(دین الٰہی ص۱۳ بحوالہ منتخب التواریخ)

لہ۔ مورخ شہیر فاضل محترم مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان ایم۔اے صاحب بزم تیموریہ جلد اوّل طبع اوّل مطبوعہ ۱۹۷۲ء ارشاد فرماتے ہیں کہ اکبر نے جو مذہبی وطیرہ اختیار کیا تھا اس کی بڑی تفصیل صرف ملا عبدالقادر بدایونی مرحوم

(باقی اگلے صفحے پر)

کہ ہیں نے جو کہا ہے وہ دین کی محبت میں کہا ہے۔ اس میں عیب جوئی، تعصب و دشمنی کا کوئی دخل نہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ صرف ملا بدایونی کی قسم پر مدار نہ رکھا جاتا بلکہ دوسرے علمی اصولوں اور نفسیاتی پہلوؤں سے بھی ان کے بیانات پر نظر ڈالی جاتی۔

جہاں تک ملا بدایونی کے "دینی جذبے" کا تعلق ہے ان کا بیان غلط نہیں۔ وہ اپنے خیال و اعتقاد کے مطابق جس حالت کو دین سمجھتے تھے اس کی خفیہ حمایت قلمی میں آپ نے کمی نہیں کی اس میں آپ سچے ہیں۔ مگر یہ سوال کہ اپنے نظریۂ دین و دیانت کی تائید میں انھوں نے "تعنت و حقد و تعصب" سے کام نہیں لیا صحیح نہیں۔ ان کے بیانات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ملا بدایونی صاحب نے ان تمام کمزوریوں سے بھرپور کام لیا ہے جن سے ان کو انکار ہے۔ اس بارے میں سب سے پہلے شیخ محمد اکرام کے قلم سے تیار کی گئی بدایونی کی تصویر قابلِ مطالعہ ہے جس سے بدایونی کی مورخانہ

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) کی تاریخ منتخب التواریخ ہی میں ملتی ہے۔ (بزم تیموریہ جلد اوّل ص۲۰۰) حضرت مولانائے موصوف بھی ملا صاحب مرحوم کے حلفیہ بیان کو اہمیت دیتے ہوئے (بزم تیموریہ جلد اوّل ص۲۰۸-۲۰۹) ملا صاحب کے حلفیہ بیان اور ناقدانہ دلچسپ اندازِ بیان کو صداقت پر مبنی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"کہیں کہیں تو ان (ملا بدایونی) کو اتنا اشتعال آگیا ہے کہ وہ ہرزہ سرائی پر بھی اتر آتے ہیں۔ وہ (ملا صاحب موصوف) تو اپنی اس جھلاہٹ کو

(باقی اگلے صفحے پر)

دیانت و امانت کے نقش و نگار پوری تابانی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔
شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:

"اس (ملا عبدالقادر بدایونی مرحوم) نے (اکبری) دربار
میں قدامت پسند گروہ کے مخالف کی حیثیت سے
سر اٹھایا۔ لیکن جدت پسندوں نے جو تیز رفتاری
اختیار کی اس کا وہ ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اُن
کی قیادت کے لیے دوسرے لوگ آگئے۔ جو اختلاف
نقطۂ نظر کے علاوہ شاید ٹھوس علمیت میں بھی اس
سے بڑھ کر تھے۔ بدایونی کی اصل خوبیاں ادیبانہ
تھیں۔ وہ (بدایونی) مذہبی طبقے کا ترجمان بنتا
ہے، لیکن اصلی روحانی خوبیوں یعنی تقویٰ، پرہیزگاری
مخالفوں سے انصاف، ظاہر و باطن کی ہم آہنگی

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) دینی درد اور دل سوزی سے تعبیر کرتے ہیں۔
لیکن موجودہ دور کے ناقدین ان (ملا بدایونی) کے
مذہبی تعصب کی شدت پر محمول کرتے ہیں۔ مگر ان
کا یہ غصہ بلکہ ان کے قلم کا کچھ کا پن ان کی تحریروں
کو بعض اوقات جاندار بھی بنا دیتا ہے۔"

(بزم تیموریہ جلد اوّل ص۲۱۸)

صاحب بزم تیموریہ نے ہی آپ کی عصبیت دینی کے نمونے اپنی اسی کتاب
کے ص۲۲۲ پر نقل فرمائے ہیں۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(ان چیزوں کا اس نے دعویٰ بھی نہیں کیا) دربار میں
اس کے لیے جلنے اور کڑھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نئی
صورتِ حال سے اسے اصولی و ذاتی اختلاف تھا۔
اس کی کتاب اکبر کے خلاف ایک چالاک بلکہ مکار وکیلِ
استغاثہ کا بیان ہے۔ غیر جانب دار منصف کا فیصلہ
نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، بے مثال نثر نگار
اور نہایت ذہین انسان تھا۔ بطور مورّخ کے بھی
(اس کی درشت کلامی اور واضح جانب داری کے
باوجود) اس کا ایک خاص انداز اور خاص مرتبہ ہے۔
اس کے ہاں صریح غلط بیانی کی شاید ہی کوئی مثال
ملے (کیا فیضی کے بارے میں روایت بھی اس مد میں
نہیں آتی؟ شہاب) لیکن معمولی حذف و اضافہ، قطع
و برید، مواد کی خاص ترتیب، ذومعنی الفاظ کے استعمال،

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) بدایونی صاحب اکبر کے امام بھی رہے تھے۔ علماء دورِ اکبری
میں شان امتیاز رکھتے تھے۔ قرآن حکیم کے عالم اور دین اسلام کے علمبردار
اور حمایتی تھے۔ اور جن پر انھوں نے تنقید کی ان میں ایک بادشاہ تھا۔
ایک ان کا استاد اور مربی شیخ مبارک تھا اور ایک مفسرِ قرآن علامہ عصر
فیضی تھا اور ایک اپنے عہد کا وزیر با تدبیر مدبّر سلطنت حکیم سیاست اور
مورّخ عہدِ اکبری ابوالفضل تھا وغیرہ وغیرہ۔ رحمہم اللہ کیا ان سے خطاب
کا یہی طریقہ تھا کہ اسے اس کے ہمدرد بھی "غصّہ" کی (باقی اگلے صفحے پر)

ترکیب مجہول (Passive Construction)
کی افراط جس سے پتہ نہ چل سکے کہ کس سے کون سے
خیالات منسوب ہیں، مبہم اشارے کنائے، ان سب
کی مدد سے بدایونی نے ایسی تصویر کھینچ دی ہے جو
حقیقت کے مطابق نہیں۔ اس نے بیسیوں ایسے
احکام گنائے ہیں جو اگر واقعی بادشاہ نے جاری
کیے تو ان کا آئینِ سلطنت میں ذکر ہوتا، اطرافِ
مملکت میں ان کے اجرار کے احکام جاری ہوتے،
کوئی دوسرا مؤرخ ان کا بیان کرتا۔ غور کرنے
سے خیال ہوتا ہے کہ ان میں کئی باتیں ایسی تھیں
جو غالباً دربار میں گفت و شنید کی حد سے آگے
نہ بڑھیں اور بعض فقط مریدانِ شاہی کی
رہنمائی کے لیے تھیں۔ کئی مذہبی اور تاریخی امور

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) "جھلاہٹ اور ہرزہ سرائی" تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔
ملا صاحب کی ہرزہ سرائی کے نمونے بزم تیموریہ حصۂ اول کے صہ ۲۲۲ پر نقل
کیے گئے ہیں۔ ملا صاحب کی تنقیدات اور قرآن حکیم کے طرز خطاب کی تعلیم کو
سامنے رکھیے اور خود فیصلہ فرمائیے۔ نہی ملا صاحب کی حق گوئی اس کا منظر
مضمون کے متن میں حاضر ہے۔

حضرت مصنف علامہ بزم تیموریہ ملا صاحب کے چھپ کر کتاب لکھنے کے
اسباب پر بحث کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بھی بیان (باقی اگلے صفحے پر)

ایسے ہیں جو عبادت خانے کے مباحثوں میں فریقین نے بیان کیے۔ لیکن بدایونی ان کا ذکر ایسے کرتا ہے گویا وہ بادشاہ (اکبر) کے خیالات کا اظہار ہیں۔ ان احکام کی جو جاری ہوئے، بدایونی اس طرح قطع و برید کرکے اور ایک خاص نقطۂ نظر کی تائید میں پیش کرتا ہے کہ اس کے باقی اندراجات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اکبر طریق تعلیم میں اصلاح کرنا چاہتا ہے اور ابوالفضل نے اس کی تفصیلات دی ہیں۔ جن کا مذہبی خیالات سے کوئی لگاؤ نہیں، لیکن بدایونی کے نزدیک وہ

(سلسلہ گذشتہ صفحہ) فرماتے ہیں کہ:۔

"اس کتاب کے لکھتے وقت ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے (منتخب التواریخ جلد ۳ صفحہ ۳۹۲ تا ۳۹۴) ان کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا۔ موجودہ دور میں ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔"

(بزم تیموریہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۹)

عبد ضعیف شہاب عرض کرتا ہے کہ اگر ملا صاحب بدایونی ہی کے بیانات کی روشنی میں ان کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے۔ میں نہیں جانتا علمائے "فلسفۂ جذبات" کیا نتیجہ اخذ فرمائیں گے۔ شہاب ۲۴ فروری (شنبہ) ۱۹۷۳ء

بھی اکبر کی اسلام دشمنی کا کرشمہ ہے۔"
(رود کوثر طبع چہارم صـ۱۱۳-۱۱۴)

بدایونی پروفیسر محمد اسلم صاحب کی نظر میں

عبارت بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بدایونی کی دیانت مورخانہ کا کیا حال ہے اور وہ اخلاق ذمیمہ جن سے بچنے کے لیے آپ نے علیم وخبیر خدا سے پناہ مانگی ہے کس حد تک انھوں نے اپنے دل ودماغ اور قلم کو ان سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بیان تو شیخ محمد اکرام صاحب کا تھا اب پروفیسر محمد اسلم صاحب جو محض ملا صاحب کی قسم کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ تاریخ نگاری کے اصول کی رعایت بھی روا نہیں رکھتے۔ ملا صاحب کے فارسی میں دیئے گئے بیان کو اردو لباس میں یوں پیش فرماتے ہیں کہ:

> "ملا عبدالقادر بدایونی جو خود کو "امام اکبر شاہ" کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے، شادی شدہ ہونے کے باوجود مکن پور کی ایک لونڈیا پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس نیک بخت کے لواحقین کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ان کی دختر نیک اختر ایک مقدس صورت ملا سے عشق فرما رہی ہیں، تو وہ ملا صاحب کو قتل کرنے کے ارادے سے مسلح ہو کر آ گئے۔ انھوں نے اس عاشق ناتواں کے جسم پر تلواروں کے نو زخم لگائے۔ یہ (ملا صاحب) بڑے

سخت جان تھے بچ نکلے ورنہ ان اشقیاء نے اپنی طرف سے انھیں شہید کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ہم (جناب اسلم) اور کہاں تک تفصیل میں جائیں بس یہی سمجھ لیجیے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔"

(دین الٰہی ص۳۴)

شیخ محمد اکرام صاحب اور پروفیسر محمد اسلم صاحب دونوں کے بیانات آپ کے سامنے ہیں۔ دونوں نے بدایونی ملا صاحب کے علم وفن، طور طریق اور افتاد مزاج کا نقشہ اپنے اپنے انداز و مذاق میں پیش کیا ہے۔ بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے ملا صاحب کے بارے میں محترم شیخ صاحب کا ایک اور بیان بھی پیش نظر رہے تو آئندہ گفتگو کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ فرماتے ہیں کہ:

"بدایونی اکبر کا پیش امام تھا۔ اس نے اپنی منتخب التواریخ میں اکبر کی بدنامی کا جو سامان جمع کیا ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بدایونی اپنی کتاب چھپ چھپا کر لکھا کرتا تھا اور اس نے کسی فرد بشر پر اس کا راز ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ وہ شروع میں آزاد خیال گروہ کا ترجمان تھا.... یہ بھی درست ہے کہ بدایونی کا مزاج اپنا تھا۔ وہ اہل شرع سے زیادہ ادیب اور فن کار تھا۔ بین خوب بجاتا تھا جو متشرع حلقوں

میں شاید ہی پسند ہو۔ طبیعت میں ایک طرح کی
وارفتگی تھی لیکن بدایونی خود لکھتا ہے کہ اکبر نے اس
کی فقاہت و تعصب کا اندازہ لگا لیا تھا۔"
(رود کوثر طبع چہارم ص۸۴)

اکبری عبادت خانے میں علماء

اکبر نے دین و مذہب کے ذکر و فکر کے لیے ایک مکان خاص کیا اور اس میں شمولیت کی دربار سے متعلق اہل دیانت و شعور کو دعوت دی گئی۔ یہ بیان بھی شیخ محمد اکرام ہی کی زبان قلم سے ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں کہ:

"اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا، لیکن انہی نے اسے بدمذہبی (؟) کا رستہ دکھایا اور ان کا ایک باعث ان علماء و فضلاء کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے نیچے کیوں بیٹھوں۔ جب یہ قضیہ طے ہوا تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی جہالت دکھاؤں (دکھائے) بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا جس سے بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا اور اس نے کہا جو نامعقول باتیں کرے اسے مجلس سے اٹھا دیا جائے۔ ملا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا

گیا۔ اس وقت آصف خاں پاس کھڑا تھا۔ ملا صاحب
نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ اگر یہی بات
ہے تو بہتوں کو اٹھنا پڑے گا۔ بادشاہ نے سنا تو
خوش ہوئے اور دوسروں کو بدایونی کے الفاظ
سنائے۔"

(رود کوثر ص۸۹ بحوالہ منتخب التواریخ جلد دوم ص۲۰۲)

ہمارے فاضل پروفیسر محمد اسلم صاحب عبادت خانے میں علمار کی شرکت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

"شروع شروع میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ
سلطان پوری عبادت خانے کے مباحثوں میں حصّہ
لینے سے گریز کرتے تھے۔ جب اکبر نے علمار کو دست و
گریباں ہوتے دیکھا تو مخدوم الملک کو تنگ کرنے
کی غرض سے عبادت خانے میں مدعو کیا۔"

(دین الہٰی ص۵۳)

جب عبادت خانے میں بجائے تحقیق حق کے علمائے کرام آپس ہی دست و گریبان ہونے اور ایک دوسرے کی جا و بے جا تردید و تکذیب کرنے لگے تب اکبر نے بدایونی کو کہا کہ جو نام نہاد عالم اس مجلس میں" بے ہودہ پن کا مظاہرہ کرے اسے وہاں سے اٹھادے۔" (دین الہٰی ص۵۳) تو کون انصاف پسند قیاس کرسکتا ہے کہ "مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری کو تنگ کرنے کے لیے" عبادت خانے میں بلایا گیا تھا۔ کیوں نہ اس کے برخلاف یہ باور کیا جائے کہ "مخدوم الملک" کی شہرت علمی اور روایتی بزرگی

کے پیش نظر خیال نہیں یقین کیا گیا تھا کہ ان کے تشریف لانے سے مجلس میں ایک وقار اور مذاکرات میں ایک علمی شان پیدا ہو جائے گی، اور اب تک جو اہم علمی اور دینی سوال لاجواب رہ جاتے رہے ہیں، حضرت مخدوم کی طرف سے ان کے جواب باصواب تسلی بخش صورت میں ملیں گے۔ اس خیال کی بجائے محترم پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ مخدوم الملک کو تنگ کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ ع

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبیت

پروفیسر بدایونی ملا صاحب کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"اکبر عبادت خانے کے مناظروں میں میرے پینترے دیکھ کر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ نوجوان (عبدالقادر بدایونی پیش نماز اکبر) حاجی ابراہیم سرہندی کا سر پھوڑے گا، پھر فرماتے ہیں کہ "ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر اکبر ابوالفضل حاجی ابراہیم سرہندی اور عبدالقادر بدایونی جیسے منہ زوروں کی پیٹھ نہ ٹھونکتا تو عبادت خانے میں پیدا ہونے والی اتنی ناخوشگواری پیدا نہ ہوتی۔ اس لیے عبادت خانے کے مباحثوں میں پیدا ہونے والی تمام بدمزگی کی ذمہ داری براہ راست اکبر پر عائد ہوتی ہے۔"

(دین الٰہی صفحہ ۵۴)

افسوس ہے ہمیں پروفیسر محمد اسلم صاحب کی اس رائے سے بالکل اتفاق

نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اکبر کی ابتدائی زندگی سے اب تک کے مذہبی میلانات واعمال ہمارے سامنے ہیں۔ اس نے عبادت خانے کی مجالس کا سلسلہ جیسا کہ ظاہر ہے ذکر وشغل مذہبی وروحانی کے لیے شروع کیا تھا۔ اس کو منتخب تاریخی، اخلاقی، متصوفانہ اور مذہبی کتابیں سنائی جاتی تھیں اور بعد میں کتب خانۂ شاہی میں داخل کردی جاتی تھیں۔ پھر تحقیق سوالات کے لیے علمائے دارالسلطنت کو بلایا جانے لگا اور انھوں نے آتے ہی اپنے کرتب دکھانے شروع کیے اور اسی ضمن میں ان کی جو جو کمزوریاں ظاہر ہونے لگیں اس کا اکبر پر یہ اثر ہوا کہ وہ بدایونی کو یہ ہدایت کرنے پر مجبور ہوگیا کہ جو شخص (نام نہاد عالم) بیہودہ گوئی کرے اسے مجلس سے اٹھادیا جائے۔

تفصیل بالا کے بعد کون منصف مزاج محترم پروفیسر صاحب کے اخذ کردہ نتیجے سے اتفاق کرے گا۔ اکبر کو الزام دینے کے بجائے کیوں نہیں کہتے کہ ظاہر پرست علماء بے عمل دوسروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت کے مصداق جب باہم دست وگریبان ہوکر علمی وروحانی اور اخلاقی لباس سے برہنہ ہوتے جارہے تھے، تو اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اکبر اس زہد فروش گندم نما جو فروش طبقے سے بالکل مایوس ہوکر، دوزخ وجنت کے ان کلید برداروں کے تنگ حلقے سے نکل کر عالم ادیان کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ ان علماء میں ایک بقول خود دردِ دین سے بے قرار اور اپنی ذات کے سوا ساری دنیا سے بیزار ملا بدایونی بھی ہیں، جنھوں نے بادشاہ کو کثرتِ ازدواج کا بدل "متعہ" کا مجتہدی رستہ سمجھایا اور گھر کی تنہائی میں بیٹھ کر اس کے دور کو اپنی تاریخ میں بے دینی

الحاد کا دور کر دکھایا تھا۔

اکبری عبادت خانے میں جو علماء مذاکروں میں حصہ لیتے تھے ان میں علامہ ابوالفضل بھی تھے۔ ہمارے پروفیسر ابوالفضل کو "کل کا لونڈا"، "طفل مکتب" اور "جس کے منہ سے ہنوز بوئے شیر آتی تھی (دین الٰہی ص۵۳) وغیرہ لفظوں سے یاد فرماتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ "بزرگی بعقل است نہ بسال"۔ اگر کم عمری ہی ایک شخص کی ناپختگیٔ علم اور خامیٔ بصیرت کی دلیل ہے، تو محترم پروفیسر صاحب کم عمر محمد بن قاسم کے لیے کیا خطاب تجویز کریں گے کہ فتح سندھ کے وقت اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور اس نے مفتوح ہندو سندھیوں سے وہی سلوک کیا تھا جو صاحب نظر فقہا نے اہل کتاب کے لیے تجویز کیا ہے (آب کوثر طبع پنجم ص۲۳-۲۴) خیر یہ تو قرن اول کا ایک نوجوان سپاہی تھا۔ حضرت حکیم الامتہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا جو اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کی وفات کے وقت سترہ سال کے تھے اور اس کم عمری میں اپنے والد مرحوم کی مسندِ درس کو زینت دینے لگے تھے۔ اور خود شاہ ولی اللہ کے انتقال پر آپ کے فرزند اکبر وارشد شاہ عبدالعزیز کے وجود سے شاہ ولی اللہ کی مسند تدریس کو رونق حاصل ہوئی تھی۔ اور اس وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر بھی سترہ سال ہی کی تھی۔ یہ اکّی دکّی مثالیں نہیں ہماری تاریخ میں تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب اسے ابوالفضل کی شیر خوارگی کا زمانہ بتاتے ہیں جب کہ اگر تاریخی واقعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ ابوالفضل[1]

---

[1] ۔ فتح پور سیکری میں شیخ ابوالفضل جب کہ اکبر کے دربار میں پہنچے ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ شہاب۔

اس وقت علوم وفنون کا منتہی ہو کر اکبر کے دربار میں رسوخ حاصل کر چکا تھا اور یہ رسوخ کسی کی سفارش اور سرپرستی سے نہیں، بلکہ محض خدا کے فضل اور اس کے ذاتی تبحر علمی سے حاصل ہوا تھا۔ اس کا ظہور قرآن حکیم کی آیۃ الکرسی کی تفسیر کی صورت میں ہوا جو ابوالفضل نے لکھ کر اکبر کے حضور میں بطور نذر پیش کی تھی۔ تفسیر کے لیے آیۃ الکرسی کا انتخاب کرنا ابوالفضل کی اعلیٰ دماغی باریک بینی اور ذہانت کی درخشاں مثال ہے۔

یہ تو محترم پروفیسر صاحب کے لہجے کی شائستگی تھی۔ اب مذاق کی پاکیزگی ملاحظہ ہو۔ ابوالفضل ہی پر گفتگو کرتے ہوئے ۱۰۰۲ھ میں ایران میں پیدا ہونے والے ایک فرقے کا حال لکھا ہے جس کے ماننے والوں کی کثرت سے ایران کے " شاہ عباس اول کا تخت ڈولنے لگا تھا" اسی لیے شاہ موصوف نے ۱۰۰۲ھ میں اس فرقے کے افراد کو جو نقطوی کہلاتے تھے، ہزاروں کی تعداد میں تہ تیغ کر ڈالا تھا۔ (دین الہٰی ص ۱۶۴ بحوالہ تاریخ عالم آرائے عباسی ونقطویان وپسیخانیان) اس فرقے کے بانی محمود پسیخانی کے بارے میں "تاریخ" کے نام سے جو اکاذیب اور بھنگیڑ خانے کے گپوں کی رپورٹ، "گاجر" اور "برہنہ" عورت کی کہانی کے رنگ میں اپنی کتاب میں (دین الہٰی ص ۱۶۵-۱۶۶) درج کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مصنف علام کو تحقیق منظور نہیں بلکہ زیر بحث دور کے نام آوروں کی تذلیل وتخفیف منظور ہے۔ نعوذ باللہ اگر یہی انداز تحقیق ہے تو کسی بھی بڑے سے بڑے زاہد وعابد ومرتاض ومقدس آب کے لیے پاک دامن ثابت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ مذہبی دنگل آرائیوں اور

اس سے زیادہ مذہب نما سیاسی مخالفتوں نے کسی بھی مدمقابل کی بدنامی اور روسیاہی میں کب اور کہاں کمی کی ہے، جو محمود پسیخانی کو بے داغ چھوڑ دیا جاتا جس کے ماننے والوں نے صفوی تاجدار عباس اوّل کے تخت و تاج کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

"بے دین" اکبر کے دیوان خاص میں اذان اور نماز

پروفیسر محمد اسلم صاحب کا عجیب حال ہے، ایک طرف تو بدایونی کو "منہ زور پینترے باز" بتا کر اکبر کو اس کی پیٹھ ٹھونکنے کا الزام دیتے ہیں اور دوسری طرف بدایونی کے بیانات کو بے چوں وچرا صحیح تسلیم کر کے اکبر اور اس کے دربار کے عمائد کی بدنامی کے لیے نئے نئے شاخسانے نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اکبر نے دیوان خاص سے ملحق مسجد میں اذان اور نماز بند کروی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ شاہ فتح اللہ شیرازی اپنے امامی مشرب کے مطابق اسی دیوان خاص میں کھلم کھلا نماز پڑھتے تھے۔ اس پر پروفیسر محمد اسلم صاحب فرماتے ہیں کہ:

> "اکبر کو ضد تو صرف راسخ العقیدہ مسلمانوں سے تھی۔" (دین الٰہی ص۱۵-۱۶)

مگر پروفیسر صاحب اس حقیقت سے چشم پوشی کر لیتے ہیں کہ شیخ موسیٰ جو سنّی عالم تھے اور بقول ملا صاحب بادشاہ کے عقیدت کیشوں میں بھی تھے، نماز کے وقت اگر اکبر کے دربار میں ہوتے تو دیوان خاص میں تنہا اذان دے کر نماز شروع کر دیتے (رود کوثر ص۱۳۱ بحوالہ منتخب التواریخ جلد ۳ ص۹۲) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد اسلم صاحب

کی نظر میں صرف ملا بدایونی راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اسی لیے ان کے لیے یہ حرکتیں ممنوع تھیں۔ مگر اکبر عجیب شان کا پیر، مرشد اور امام تھا کہ اپنے باصفا مریدوں کو اپنے سامنے اپنے مشرب کے خلاف اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے دیکھتا تھا اور اس کی رگِ عصبیتِ مرشدیت نہیں پھڑکتی تھی۔ جب کہ معمولی سے معمولی مریدوں کے نذرانوں پر گزارا کرنے والے خانقاہی مرشد معمولی سے معمولی اختلاف پر سلام و کلام ہی نہیں مکمل مقاطعہ کرنے کا حکم صادر کر دیتے ہیں۔

فیضی کی ادبی کرامت سواطع الالہام اور بدایونی

حکیم ابوالفیض فیضی نے "سواطع الالہام" کے نام سے پچھتر جزو میں قرآن حکیم کی بے نقط تفسیر لکھی۔ اس کی تالیف میں حسب بیان ملا بدایونی لاہور کے مشہور فاضل اعلم العلماء مولانا جمال تلوی نے فیضی کا ہاتھ بٹایا اور جیسا کہ حضرت مجدد سرہندی کے بعض معاصر سوانح نگاروں کا بیان ہے خود حضرت موصوف نے بھی ایک آدھ مشکل مقام کی اسی صنعت غیر منقوط میں تفسیر لکھ کر فیضی کی مشکل حل کی تھی۔ اور حضرت مجدد کے استاد مولانا یعقوب صرفی نے اس کتاب کی تقریظ لکھی۔ بھلا اگر خدانخواستہ فیضی ایسا ہی ملحد تھا جیسا ملا صاحب اسے دکھانا چاہتے ہیں اور ہمارے فاضل یگانہ پروفیسر صاحب ملا صاحب سے متفق ہیں، تو کیا اس عہد کے ایسے ایسے مشاہیر بزرگوار فیضی ایسے "ملحد" شخص سے ربط ضبط رکھتے۔ اور تفسیر کلام اللہ میں اس کا ہاتھ بٹاتے؟ سب سے عجیب بات یہ کہ ان بزرگوں کو فیضی کے ہاں وہ سب کچھ نظر نہ آیا جو ملا صاحب برملا دیکھا کرتے

بھی فیضی جیسے ملا صاحب منکرِ نبوت قرار دیتے ہیں۔ حمد باری تعالیٰ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں نذرانۂ عقیدت جن لفظوں میں پیش کرتا ہے ان کا ترجمہ یہ ہے کہ :

"اصل مقصد صرف اللہ ہے۔ اس کے بعد رسول ہیں جن کو اُس نے عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ وہ مراد تک پہنچانے والے ہیں۔ ان کی تعداد کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سب سے پہلے آدم ہیں اور آخر بس محمد صلعم ہیں جو رسولوں میں سب سے کامل، اسرار کے سب سے زیادہ جاننے والے، احوال میں سب سے زیادہ قابل تعریف، کمالات میں سب سے بلند، ولا میں سب سے اکرم، سب سے اونچے پرچم والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ ہی کے لیے حمد کا لوا ہے۔ اور آپ کا مقام محمود ہے۔ اُن کا لوا اہل ولا کا کمال اور ان کی دعا آسمان کی الواح کا نقش ہے۔"

(رود کوثر طبع چہارم صفحہ ۱۳۴ بحوالہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۶۵ء)

میں نہیں سمجھتا کہ اوپر کی عبارت پڑھ کر کون قلب سلیم رکھنے والا ان الفاظ میں اپنے جذبات عقیدت ظاہر کرنے والے شخص کے ایمان و اسلام کے بارے میں کسی سوءِ ظن میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی (خدا ان کی اور ہماری خطا معاف فرمائے) کس بے دردانہ انداز سے لکھتے

ہیں کہ فیضی نے یہ :

(۱) "تفسیر بے نقط برائے شستن بدنامی (۲) کہ تا روز جزا
بصد آب دریا شستہ نہ گردد (۳) در عین حالت مستی
(۴) و جنابت می نوشت (۵) وسگاں آن را از ہر طرف
پائمال می ساختند" (رود کوثر ص۱۳۵ طبع چہارم بحوالہ
منتخب التواریخ در ذکر فیضی) لکھی تھی۔

اب شق وار غور فرمائیے :

۱۔ "برائے شستن بدنامی" لکھی تھی۔ میں عرض کروں گا کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں عین سعادت ہے۔ کیونکہ ہر شریف انسان جس کا ضمیر مر نہ گیا ہو، ہر قسم کی "بدنامی" کو دھونا ہی پسند کرے گا۔ چاہے وہ بدنامی خود اس کی کسی غلطی کا نتیجہ ہو یا اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کی اڑائی ہوئی دھول اور اچھالی ہوئی کیچڑ کا دھبا۔

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب یا تو ستار و غفار خدا کی ذات سے مایوس ہیں یا اپنی غیب دانی کے زعم میں فرماتے ہیں کہ "بدنامی تا روز جزا بصد آب دریا شستہ نہ گردد۔" کوئی پوچھے کہ حضرت ملا صاحب آپ رحمت الہٰی اور مغفرت خداوندی سے اتنے مایوس کیوں ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کیا آپ نعوذ باللہ خدا ہیں اور معافی آپ سے مانگی گئی ہے اور آپ کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ فیضی کا دامن بدنامی دھویا ہی نہ جائے گا۔

۳۔ لیکن ملا صاحب کے اسی جملے میں ستم بالائے ستم یہ لفظ بھی درج ہیں کہ :

"در عین حالت مستی و جنابت می نوشت وسگان
آن را از ہر طرف پائمال ساختند۔"

"عین حالت مستی" تو سمجھ میں آسکتی ہے۔ مست شرابیوں کو کس نے نہیں دیکھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نشے کے درجے ہوتے ہیں۔ مگر نشے کی وہ حالت جسے "عین مستی" کہا جائے۔ کیا ایسی بھی ہوتی ہے جس میں حواس مخمور کے قابو میں رہیں اور وہ "سواطع الالہام" جیسی ایک علمی کرامت روشن ادق کتاب لکھنے کی اس میں اہلیت باقی رہتی ہو ـــــ کون اسے باور کرسکتا ہے ـــــ مگر ملا صاحب قسم کھا کر یہ جھوٹ بول رہے ہیں ـــــ ہاں ایک اور قسم کی مستی کا بھی امکان ہے ـــــ وہ مستی محبت الٰہی اور عشق رسالت پناہی (صلوات اللہ علیہ) کی شراب شوق کی سرشاری ہو ـــــ یہ بھی ممکن تو ہے ـــــ مگر فیضیؔ کے بارے میں اس حالت مستی سے ملا صاحب کو انکار ہے۔

۴۔ چہارم۔ اس روایت کی چوتھی شق ہے کہ فیضی یہ عظیم الشان کتاب حالت "جنابت" میں لکھا کرتا تھا۔ ملا صاحب کی سنگ دلی کی دلیل کے علاوہ خود کھلا ثبوت ہے کہ ان کی یہ قیاس آرائی کی ایک شدید ضیقِ نفس کے مریض کے بارے میں ایک ناپاک تعبیر ہے۔ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۵۔ پنجم۔ اس روایت کی پانچویں شق ہے کہ تفسیر کے مسودے کے اوراق کو "سگاں از ہرطرف پامال ساختند"۔ گویا فیضیؔ کا گھر نہ تھا، ایک کوڑے کا ڈھیر یا کباڑ خانہ تھا جس میں بے سلیقگی سے چیزیں یونہی اِدھر اُدھر بکھری پڑی رہتی تھیں اور خود فیضیؔ ایسا بے سلیقہ اور اتنا بے پروا شخص تھا کہ خونِ جگر سے لکھی ہوئی اپنی شاہکار تصنیف کے اوراق کتوں سے پامال ہوتے دیکھتا تھا اور ذرا محسوس نہ کرتا تھا کہ یہ کیا

ہو رہا ہے۔ فیضی نعوذ باللہ بقول بدایونی ملا صاحب ملحد ہی سہی اور ایک ملحد سے خدا و رسول و قرآن حکیم کے بارے میں بے ادبی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اپنے شاہکار علمی کارنامے کو یوں پامال ہوتا گوارا کر سکے۔ خود ملا صاحب چھپ چھپ کر تاریخ لکھیں۔ وہ بھی اس احتیاط سے کہ زندگی بھر کسی کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دیں۔ اس کا مکمل نسخہ تو کسی کو کیا دکھاتے، مسودے کا کوئی ردّی کاغذ تک دوست دشمن کی نگاہ سے چھپاتے رہیں اور فیضی بقول ملا صاحب اپنی وہ تصنیف جسے وہ اپنی بدنامی دھونے کے لیے لکھ رہا تھا اس کی طرف سے اتنا بے پروا کہ اس کے مسودے کے اوراق گھر کے آنگن میں یونہی اِدھر اُدھر بے پروائی سے پڑے رہنے دیتا تھا کہ آدمی نہیں کتے انھیں پامال کیا کرتے تھے۔ جھوٹ بولنے کے لیے بھی ہوش کی ضرورت ہے۔ بس صرف ملا صاحب ہی فیضی کے گھر کا یہ منظر دیکھتے تھے اور ان کے سوا کسی اور کو یہ نظارہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ فیضی سے ملنے والوں میں لاہور کے اعلم العلماء مولانا جمال تلوی تھے۔ حضرت مجدد کے استاد مولانا یعقوب صرفی تھے اور خود حضرت شیخ احمد سرہندی ملقب بہ مجدد تھے (رود کوثر طبع چہارم ص ۱۳۳-۱۳۴) ان میں سے کوئی ایک تو اس بات کا ذکر کرتا اور فیضی کے اس پھوہڑپنے پر اسے متنبہ کرتا اور تفسیر قرآن حکیم کی اس بے ادبی سے بے زاری ظاہر کرتا ـــــ ملا صاحب تو آتش حسد و تعنت میں بھُن رہے تھے۔ ان باتوں کو کیا دھیان میں لاتے۔ ہمارے نوجوان فاضل محترم پروفیسر صاحب نے بھی غور نہیں فرمایا کہ ملا صاحب کا پیش کردہ منظر فیضی کی بدنامی کو دھونے والا تھا یا اس کی بدنامی کا ڈھنڈھورا۔

فیضی اور نعت رسول۔ پروفیسر صاحب کی رسول شناسی

یہ تو ملا عبدالقادر بدایونی کی حق سرائی تھی۔ اس پر قناعت نہ کر کے ہمارے پروفیسر صاحب فیضیؔ کو ملحد ثابت کرنے کے لیے نئے رخ سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ:

"بدایونی کے معترضین یہ کہتے ہیں کہ فیضیؔ نے تفسیر سواطع الالہام اور اپنی مثنوی نل دمن کے آغاز میں حضور (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی نعت لکھ کر اپنی اسلام دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہم (یعنی پروفیسر محمد اسلم صاحب) آن (یعنی بدایونی کے معترضوں) سے پوچھتے ہیں کہ کیا ملحدوں نے قرآن پاک کی تفسیریں نہیں لکھیں؟ اگر ملاحدہ کی تفسیروں کی فہرست تیار کرنے بیٹھیں، تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ جہاں تک فیضیؔ کی نعت گوئی کا تعلق ہے اس ضمن میں عرض ہے کہ آج بھی بہت سے ہندو اور سکھ شاعر موجود ہیں جنھوں نے حضور سرور کائنات کی شان میں معرکہ آرا نعتیں لکھی ہیں۔ کیا ان نعتوں کو ان کی اسلام دوستی پر محمول کیا جائے۔"

(دین الٰہی ص۱۹)

آپ کی تحریر بالا سے ظاہر ہے کہ "ملحدوں" نے قرآن کریم کی اتنی تفسیریں لکھی ہیں کہ اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔

جناب پروفیسر صاحب کے دعوے سے ظاہر ہے کہ قرآنیات کا ایک عظیم ذخیرہ آپ کے پیش نظر ہے۔ اس لیے فہرست تیار کرنے میں کسی اور کی ضرورت نہ ہوگی۔ مگر بندہ بشر ہے۔ اگر ایسے دفتر کی تکمیل میں کمی رہتی ہو تو اپنے استادوں اور مربیوں سے مدد لے کر ایسی تفسیروں کی فہرست ضرور تیار کیجیے۔ اس سے قرآن حکیم کے طالب علموں کو تقابلی مطالعۂ قرآن حکیم میں بہت مدد ملے گی۔ مگر فہرست تیار کرتے ہوئے یہ بات ضرور پیش نظر رکھیے کہ جن ملحدوں کی ملحدانہ تفسیروں کو آپ اپنی فہرست میں جگہ دیں گے۔ ان کے نقطۂ نظر سے ان کے اور ان کے پیش رووں کے مسلک کے مطابق آپ اور آپ کے ہم خیال نعوذ باللہ ملاحدہ کے زمرے میں نہ شمار کر لیے جائیں۔

غیر مسلم اور نعت رسول

رہی ہندو اور سکھ شاعروں کی نعت گوئی اور پروفیسر محمد اسلم صاحب کی طرف سے ان کی داد بے داد، تو اس کے بارے میں بکمال ادب عرض ہے کہ پروفیسر صاحب کی نظر میں وہ "اسلام دوستی" نہیں۔ ہماری رائے میں ان نظموں اور نعتوں کے پڑھنے والے غیر متعصب افراد کی نظر میں ایسے ہندو اور سکھ نعت گو شعراء کی نعتیں رسول دوستی بھی ہیں اور اسلام دوستی بھی۔ ذوق کی کمی اور لفظوں کا ہیر پھیر ہے ورنہ رسول دوستی ہی اسلام دوستی ہے۔ دونوں میں کوئی غیریت نہیں۔ تعجب ہے کہ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کے ہم خیال نام نہاد اسلامی نمائندے کسی شاتم رسول کو مجرم قرار دے کر قتل کرا دیں تو قاتلوں کی اسلام دوستی ظاہر ہو جاتی ہے

اور کوئی "غیر مسلم" حسن و جمال و کمال رسول سے متاثر ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھے تو پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے استاد حضرت محمد اسلم اسے "اسلام دوستی" کا نام دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ خیر اگر پروفیسر صاحب کو یہی اصرار ہے کہ فیضی کی نعت رسول ایک شاعرانہ ادبی دستور کی پیروی ہی تھی جس کا عقیدہ یا عقیدتِ رسول سے کوئی تعلق نہ تھا تو میں عرض کروں گا کہ جب بقول ملا بدایونی فیضی اپنے ملحدانہ عقیدے کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہ ہوتا تھا تو ایسا باغی بے خوف ملحد کسی نامعقول نامرغوب عصری رواج کی پیروی کی بجائے کوئی اور راہ و رسم ایجاد کرتا، عام روش کی پیروی کیوں کرتا۔

فیضی کا آخری وقت۔ بدایونی اور پروفیسر صاحب

انسان کتنا کوتاہ نظر خود بین اور انجام سے بے خبر ہے۔ مخالفت کے زور میں کچھ کا کچھ کہہ جاتا ہے۔ بدایونی نے یہ لکھا ہے کہ "فیضی کی حلق سے نزاع[1] کے عالم میں کتے کی آواز نکلتی تھی۔" (دین الہٰی ص ۱۹) ہمارے پروفیسر محمد اسلم صاحب کو بدایونی کے صدق مقال پر اتنا اعتماد ہے کہ بدایونی کی کذب بیانی کو سچائی ثابت کرنے کے لیے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> "جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے یہ بات طبی نکتہ نظر[2] سے صحیح ثابت ہو سکتی ہے۔ عام طور پر باؤلے کتے کے

---

[1] نقل مطابق اصل "نزاع" میں الف زائد ہے۔ شہاب
[2] نقطۂ نظر۔ شہاب

کاٹے ہوئے مریض کے گلے کی رگیں اینٹھ جاتی
ہیں اور وہ جب بات کرنا چاہتا ہے تو اس کے
حلق سے کتے جیسی آواز نکلتی ہے۔ فیضی کو چونکہ
کتوں کے ساتھ پیار تھا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ
کسی کتے نے اس کے جسم پر معمولی سی خراش لگادی
ہو جس کی اس نے اس وقت پروا نہ کی ہو، لیکن بعد
میں یہی خراش ایک مرض بن کر غالب آگئی ہو۔ طبی
نکتۂ نظر[1] سے ایسا ہونا عین ممکن ہے۔"

(دین الٰہی ص ۲۰)

ممکنات کی دنیا غیر محدود ہے۔ بحث واقعات و حقائق سے ہے۔ ملا صاحب نے بغض و عناد کی وجہ سے اور آپ نے متقشفانہ پاکستانی حمیت کی وجہ سے غیر علمی انداز فکر کے زیر اثر ایک بیش پا حقیقت کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی، جو یہ ہے کہ فیضی شدید مرض ضیق النفس میں مبتلا تھا اور اس مرض کے مریض کو عسر تنفس کے دورے کی حالت میں جس نے دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ مریض کے حلقوم سے کیسی کیسی آوازیں نکلا کرتی ہیں۔ چونکہ فیضی اسی موذی مرض کا مریض تھا ملا صاحب نے عندالملاقات گھر کے دربان کتے یا کتوں کو دیکھا اور فیضی کو مرض کے دورے کی حالت میں پایا، بس پھر کیا تھا، ایک ظالمانہ فقرہ سوجھ گیا کہ نزع میں کتے کی آواز نکلتی تھی۔

---

[1] نقطۂ نظر۔ شہاب

شیخ مبارک رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب

پروفیسر محمد اسلم صاحب کو اصرار ہے کہ شیخ مبارک مرحوم "زیدی شیعہ" تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا "زیدی شیعہ" ہونا یا شیعیت کی کسی بھی شاخ سے متعلق ہونا کوئی جرم ہے۔ اس عقائد کی جنگ ہی نے دور اسلام کی تاریخ کو داغ دار اور اسلامیوں کو ذلیل وخوار کر دیا ہے یہ ایک سیاسی نعرہ تھا جس نے عالم اسلام میں کلمہ گوؤں کے حصے بخرے کر دیے۔ چلو خیر شیخ مبارک "زیدی شیعہ" ہی تھے۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے باوجود اپنے پردادا علی ابن ابی طالب کی فضیلت کے قائل ہونے کے عین میدان جنگ میں پہلے تین راشد خلفاء کی حقیت وعظمت پر جان تک دے دی تھی۔ اور آنجناب کی طرف منسوب جماعت (جن کی کچھ عرصہ پہلے تک یمن میں حکومت تھی) خلفاء ثلاثہ کی خلافت حق تسلیم کرتی ہے۔ پاکستان میں بیٹھ کر شیخ مبارک کی شیعیت کو معرض بحث میں لانا کچھ عجیب سی بات ہے۔ کیا محترم پروفیسر محمد اسلم صاحب اس سے واقف نہیں کہ پاکستان کے بانی مرحوم مسٹر محمد علی جناح شیعہ تھے (السٹریٹڈ ویکلی ۱۰ مارچ ۱۹۷۲ء) مسٹر سکندر مرزا شیعہ تھے۔ جنرل آغا یحییٰ خاں قزلباش شیعہ ہیں اور موجودہ صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بھی شیعیت سے بے گانہ نہیں۔

ہمارے پروفیسر صاحب ابوالفضل کو آزاد خیال شیعہ انقلابی عالم شریف آملی کا پیرو تجویز کر کے اسے ملحد نقطوی اور خدا جانے کیا کیا

ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ میل جول اور تعلقات اور چیز ہیں۔ مذہبی ہم آہنگی بالکل جدا چیز ہے۔ ابوالفضل کے اگر شریف آملی سے روابط تھے اور ان میں باہمی خط و کتابت بھی تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ ان دونوں میں سو فی صدی ہم عقیدتی بھی تھی۔

ابوالفضل کا فرزند عبدالرحمان اور شیخ مبارک کے داماد اور خواجہ کلاں

جہاں تک ابوالفضل کی شیعیت کا تعلق ہے، ہمیں اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ اس کے بیٹے کا نام عبدالرحمان تھا اور قاتل علی ابن ابی طالب ابن ملجم کا نام بھی عبدالرحمان ہی تھا۔ ایرانی اور ہندی مسلمانوں میں یزید نام قتل حسین کی نسبت سے متروک و معتوب ہے۔ اور عبدالرحمان ابن ملجم کی نسبت سے یہ نام بھی باخبر شیعوں میں پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر کسی باخبر شیعہ کا نام عبدالرحمان ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔ ابوالفضل کی بہن شیخ مبارک کی دختر نیک اختر حضرت خواجہ باقی باللہ کے دہلوی خلیفہ خواجہ مرزا حسام الدین کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے خورد سال بچوں کی پرورش انہی کے گھر میں ہوئی تھی۔ خواجہ باقی باللہ کے فرزند خواجہ کلاں نے اپنی کتاب میں ابوالفضل پر تنقید کی ہے۔ (یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری تاکہ صحیح طور پر اندازہ ہوتا کہ تنقید کی نوعیت کیا ہے۔ شہابؔ) ابوالفضل اپنے بہنوئی سے ناراض تھے۔ بڑی وجہ بظاہر یہ ہو سکتی ہے کہ خواجہ حسام الدین نے سرکاری عہدہ چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ بہر حال خواجہ کلاں کی تحریر کو خاندان مبارک کے کسی فرد کے خلاف سند کیوں بنایا جائے۔ کیونکہ ایسی مخالفتیں کوئی

ندرت کی بات نہیں ہیں۔ اگر شیخ عبدالنبی صدر الصدور اپنے صوفی عالم و عارف پدر بزرگوار حضرت شیخ احمد بن حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہما اللہ کے خلاف کتاب لکھ سکتے ہیں تو شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں پرورش پانے والے ایک محترم پیرزادے نے اگر اپنے مربیوں کے بزرگوں پر تنقید کردی ہو تو اس پر تعجب اور خوشی کس لیے؟ اور اسے سند کیوں بنایا جائے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی علمی و روحانی استاد کے نام لیواؤں میں نظری مسائل میں اتنی بیگانگی اور تلخی نظر آتی ہے کہ غیروں میں اتنی نہیں ہوتی۔ بہرحال مسائل کی صحت و عدم صحت دلائل علمی پر موقوف ہے نہ کہ کسی پیر یا محترم پیرزادے کی قیل وقال پر۔

اکبر کی علمار سے مایوسی

ہم دورِ اکبری کے عمائدِ اسلام کے رنگ دیکھ آئے ہیں۔ خود جناب پروفیسر صاحب کی کتاب اکبری عہد کے علمائے شریعت اور پیشوایان طریقت کے کارناموں سے داغدار یا لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ جب عالم یہ ہو تو غریب اکبر کو کیا الزام دیا جائے۔ وہ علمار کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے جنھیں اقامتِ دین و شریعت کے دعوے ہیں، لیکن خود ان کی زندگی دین اور شریعت کا مذاق ہے اور صوفیوں کی طرف ملتجیانہ دیکھتا ہے تو وہاں بھی دعوے بڑے اور درشن چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ حیرت زدہ ہوکر حافظ کا یہ شعر پڑھتا تو حق بجانب تھا ؎

مشکلی دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

اور آخر کار اگر یہ بھی پکار اُٹھے تو معذور ہو گا کہ :

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوٹے ترے فسانے

لیکن الحمد اللہ نہ اس نے حرم کو چھوڑا نہ ہردوار کو —— البتہ غلط کاروں سے علیحدگی اختیار کی اور تلاش حق کو جاری رکھا۔

اکبر اور مذہبی تحقیقات

اکبر کوئی ایچ میر زکس میرس، غیر ذمے دار اور غیر معروف عوام میں سے ایک عام فرد نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک بڑی سلطنت کا باقتدار بادشاہ تھا۔ جس مملکت میں ایک مذہب، ایک فقہ، ایک رسم و رواج اور ایک فلسفہ اور ایک روایت کے ماننے والے لوگ نہیں بستے تھے۔ بلکہ اس کی بجائے مختلف مذاہب و رسوم و روایات کے قائل وعامل بستے تھے۔ جب اس نے محسوس کیا کہ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ اس کا بھارت ہے ایک فرقہ یا فرقوں کی خصوصیات کو مٹانا کسی کو گھٹانا اور کسی کو بڑھانا اور چڑھانا، ایک کی روایات کو آنکھیں بند کر کے سر آنکھوں پر رکھنا اور دوسروں کی روایات سن کر ناک بھوں چڑھانا اور ان میں نئی نکالنا اور انھیں انبار خرافات قرار دینا، آئین عدل و انصاف اور آئین رعیت پروری کے سراسر خلاف ہے۔ (اسی لیے جب اس نے سب سے پہلے اسلامی فرقوں کے خیالات و فقہیات کی رنگارنگی

اور باہم ایک دوسرے کے دلائل کے اثبات و ابطال کے نظارے کیے، تب ملک میں بسنے والے دوسرے اہل مذاہب کو دعوت دی کہ آئیں اور اپنے اپنے دین و آئین کے محاسن بیان کریں۔ اس مجلس میں مسلم علماء جو باہم کٹے مرتے تھے، ایسا بھی ہوا کہ غیر مذاہب کے بیانات سن سن کر کچھ حیرت زدہ سے ہو گئے۔ قرآن حکیم کے حقایق سے بے خبر نام نہاد علماء محض نقہ کی چند چھوٹی بڑی کتابوں میں گم رہنے والوں سے مخالفوں کے سوالوں کے جواب نہ بن پڑتے دیکھ کر بعض اوقات اکبر نے علماء کی دستگیری کی اور فریقین کے مزعومہ "حق" کو ناحق اور مطعون "ناحق" کو حق ظاہر کر کے اپنی حق پسندی کا ثبوت دیا۔ ملا بدایونی اسے دین اسلام یا دین محمدی و احمدی سے برگشتہ بتاتے ہیں[1]۔ اور ملا صاحب بدایونی کی تقلید میں پروفیسر محمد اسلم صاحب اسے مرتد ثابت کرنے کو اپنا بہت بڑا کارنامہ خیال کرتے ہیں۔ اور بعض اہل علم و فضل حضرات پروفیسر صاحب محترم کے نظریے کو بالکل نیا اور انقلاب آفریں نظریہ ٹھہراتے ہیں۔ اب ابوالفضل کے زبان قلم سے اکبر کے خیالات سنیے:

---

[1] بدایونی ملا صاحب کے بالمقابل شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی کتاب "ذکر ملوک" میں جس کا مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ اکبر کو "خلیفۂ عہد و سلطان زمانہ و شہنشاہ آفاق و حاکم علی الاطلاق" تسلیم کرکے اس کے حق میں دعائے خیر فرماتے ہیں۔

(دیکھو "تاریخی مقالات" پروفیسر خلیق احمد نظامی طبع اول ص ۱۳۷) شہاب

"بادشاہ (اکبر) فرماتے تھے کہ اس سے پہلے جب
میں ظاہر بینوں کا ہم خیال تھا، میں سمجھتا تھا کہ
ظاہر آرائی اور بغیر دلی قبول کے مسلمانی کا دعویٰ
کرنا فائدے مند ہے۔ چنانچہ میں کئی ہندوؤں کو
ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین میں لایا۔ لیکن
اب کہ شہرستانِ باطن کی حقیقت مجھ پر منکشف
ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس آشوب گاہِ
اختلاف میں عقل کا راستہ اختیار کرنا چاہیے
اور نہیب سلطانی سے زبان پر کلمۂ شہادت
نکلوانا، ختنہ کرانا اور ظاہری تسم سے سجدہ
کرانا خداطلبی نہیں ہے

طاعت آں نیست کہ برخاک نہی پیشانی
صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

ضرورت اس کی ہے کہ نفس خود آرا کو شکست
دی جائے اور خواہش اور غصے کو سلطان عقل
کے تابع کیا جائے۔ مختلف مذاہب کے متعلق
بادشاہ نے بارہا کہا کہ آدمی وہ ہے جو انصاف
کو اپنا راہنما بنائے۔ اور ہر گروہ سے جو چیز عقل
کے مطابق ہو اخذ کرے۔ شاید اسی طرح وہ قفل
جس کی چابی گم ہوگئی ہے کھل جائے۔"

(رود کوثر طبع چہارم صہ ۹۳ بحوالہ اکبر نامہ جلد سوم صہ ۲۵۶-۲۵۷)

ارشاد ہو اوپر کے بیان میں کون سا الحاد ہے اور کس حقیقت حقہ سے ارتداد ہے ؟

اکبر کا الوہیت یا نبوّت کے دعوے سے انکار

عبد اللہ خاں اُزبک والیٔ ترکستان نے اپنے ایک خط میں اکبر کو لکھا کہ آپ کی نسبت پیغمبری بلکہ خدائی کے دعوے سننے میں آتے ہیں۔ اس کے جواب میں اکبر نے جو لمبا خط لکھا اس کے مسودے اکبر نامہ اور انشاء ابوالفضل میں موجود ہیں۔ اس خط میں پہلے اکبر نے دربار کے بعض علماء کی شکایت کی ہے کہ وہ نہ صرف عقل وخرد سے خالی تھے بلکہ قرآن مجید کی غلط ترجمانی کرتے تھے اور اس کی بناء پر شاہی میں اختیارات چاہتے تھے۔

"(وفرمانِ آسمانی ونامۂ جاودانی را کہ فرستادۂ خدا و ستائیدۂ پیغمبر است از شاہراہ گردانیدہ برنگ دیگر وامی نمایند ومجملات نصوص را تاویلات وتسویلات نمودہ می خواہند در فرمانروائی وکارگزاری شریک بادشاہی باشند)
جب ان باتوں کی تحقیق اور اختلافی امور کی تفتیش کے دوران میں ظاہر بینوں کا پول کھلا اور وہ پایۂ اعتبار سے گر گئے تو انھوں نے حسد وعداوت سے غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور ہماری (یعنی اکبر کی) نسبت نبوت والوہیت کے دعوے

منسوب کیے ورنہ کہاں بندۂ عاجز اور کہاں یہ
دعویٰ۔" (رود کوثر طبع چہارم ص۱۱۱)

اکبر کا بیان آپ کے سامنے ہے۔ نہ خدائی کا دعویٰ ہے نہ نبوت کا ادعا اور نہ قرآن سے روگردانی۔ اگر کچھ ہے تو صرف علماء سو کا شکوہ ہے اور اس کے اسباب روز روشن کی طرح اہل نظر کے سامنے ہیں۔

پاکستانی فاضل شیخ محمد اکرام صاحب عہد اکبری کے کئی عینی شاہد مورخوں کے نام گنوانے کے بعد فرماتے ہیں کہ :

"مذہبی تاریخ کی تفاصیل کے راوی فقط تین ہیں۔ ابوالفضل، بدایونی اور پرتگیز پادری اور وہ اپنے بیان میں متفق نہیں۔ ابوالفضل اور دوسروں کے اندراجات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ابوالفضل تقلیدی اسلام سے اختلاف ظاہر کرتا ہے (اور شیخ مبارک اور مخدوم الملک کے نقطۂ نظر میں جو اختلاف تھا وہ محتاج بیان نہیں) لیکن وہ (ابوالفضل) اکبر کے احکام اور اسلام میں کوئی تناقض نہیں بتاتا اور اس (ابوالفضل) کی تصانیف میں بادشاہ کا کوئی ایسا حکم نہیں جس سے اسلام کی مخالفت یا تحقیر ظاہر ہو۔ برخلاف اس کے بدایونی اور پرتگیزی پادری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر مسلمان نہ رہا تھا بلکہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔" (رود کوثر طبع چہارم ص۱۱۱)

جہانگیر نے توزک میں اپنے مرحوم و مغفور باپ کے مسلک کو صلح کل کا مسلک بتایا اور چھوٹی تزک میں لکھا ہے کہ اکبر بطور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان کے مرا۔ (رود کوثر طبع چہارم ص۱۶۰) یہ وہی جہانگیر ہے جو چند روزہ دنیوی سلطنت کے لیے اپنے بوڑھے باپ کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ جہانگیر کی رائے کو یوں ہی ٹالا نہیں جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ اسے علماء کی تائید حاصل تھی لیکن اس نے وہی بات کہی جو سچی تھی۔

مسلم کون ہے

"مسلم" کی حقیقت کیا ہے اور خداوند عالم کی نظر میں مسلم یعنی "فرمانبردار حق" کون ہے۔ اور ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی اپنی آل و اولاد کو وصیت لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲/۱۳۲) کے معیار پر کون پورا اترتا ہے۔ اس کا فیصلہ تو خدا کے حضور ہی یوم الحساب کو ہوگا۔ مگر جہاں تک ظاہری دنیا یا کم سے کم ہماری دنیا یعنی ہندوستان کا تعلق ہے، ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو خود کو "مسلم" کہتا یا "مسلم" کہلانے سے انکار نہیں کرتا۔ خواہ "اسلام" نام کے مذہب کی کسی بھی جدید یا قدیم جماعت یا شاخ سے تعلق رکھتا ہو یا جماعت بندیوں سے آزاد ہو "علماء اسلام" کا کوئی فرد یا طبقہ اپنے مد مقابل یا اپنے سے غیر طبقہ کو کچھ کہتا یا سمجھتا ہو اور اسے اپنے سے غیر فرد یا جماعت کی تکفیر و تفسیق پر کتنا ہی اصرار ہو وہ فرد یا جماعت "مسلم" یا "مسلمان" ہے۔ انہی معنوں میں اکبر، فیضی اور ابو الفضل "مسلم" تھے اور ہم ایسے مدعیوں سے بہتر مسلم تھے کیونکہ ہم محض باتیں بناتے ہیں اور اُن کو جب موقع ملا، انھوں نے علیٰ قدر

مراتب خدا کے بندوں کو فیض پہنچایا، خود حق کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی بصیرت کے مطابق حق کو برت کر دکھایا۔ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کو اپنے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا اتنا زعم ہے کہ اکبر کے مرتد ہو جانے کا باصرار یقین دلا رہے ہیں، حالانکہ یورپ کے مسیحی پادری جو اکبر کو اپنا ہم خیال بنا لینے کی خوش خبریاں یورپ میں اپنے ہم وطنوں کو مسلسل پہنچا رہے تھے۔ اکبر کی وفات پر اعتراف کرتے ہیں کہ وہ دین محمدی پر یعنی مسلمان مرا۔" (رود کوثر طبع چہارم ص۱۶)

واعظِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

حکومت کی نظر میں سب برابر

جو حکومت اپنی رعایا یا ملک کے باشندوں میں مذہب، مسلک، دھرم، ذات پات اور رنگ و نسل کے پیش نظر یعنی ایک ہی ملک کے باشندوں میں "اپنے" اور "غیر" کی تفریق کرتی اور ایک دوسرے سے امتیازی سلوک روا رکھتی ہے، وہ حکومت بدل دیے جانے کے قابل ہے۔ یہ نئی بات نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

ہندوستان میں ہندوستان کی وہی جائز، قانونی، اخلاقی ہندوستانی حکومت ہو سکتی ہے جو تمام ہندوستانیوں کو مذہب و رنگ و نسل اور درنوں کے خانوں میں تقسیم نہ کرتی ہو بلکہ اس کی میزان عدل میں ہندوستانی یا بھارتی سب برابر ہوں۔ حاکم کا طرز عبادت کچھ بھی ہو مگر اس کا پیمانۂ معدلت ایک ہی ہونا چاہیے۔ اکبر سے

پہلے بھی اس کی مثالیں زمینی بادشاہوں میں موجود ہیں مگر بھارت کے عہد ماضی میں اکبر کی حکومت اسی مسلک فرماں روائی کی ایک زبردست کوشش تھی، اسی لیے اکبر کی حکومت صحیح معنوں میں سیکولر کہلانے کی مستحق تھی۔ اس انداز حکومت سے ملا بدایونی یا حضرت مجدد سرہندی یا بعد میں آنے والے کسی اور بزرگ کا یہ قول کہ کسی خاص فقہ شرعی پر عمل ہونا ہی اسلام ہے، کتنا ہی مخلصانہ ہو صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ان کا ناراض ہونا اسرار حکومت صالح سے بے خبری اور غیر ذمہ داری کی دلیل ہے کیونکہ ایک غیر ذمہ دار شخص نظری حقایق تو بہت سے بیان کرسکتا ہے، مگر ایک ذمہ دار شخص جذبات کی رو میں بہہ کر دامن عدل و انسانیت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

ہمارے فاضل پروفیسر محمد اسلم صاحب اکبری عہد کی ساری خرابیوں کی جڑ عقیدۂ وحدت الوجود کو ٹھہراتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ جیسے عوام کے نام نہاد پیروانِ شریعت یا ان کے کج راہ "مقتداؤں" کی غلطیوں اور غلط کاریوں کا ذمہ دار شریعت حقہ کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا، ویسے ہی وحدت الوجود کے عقیدے کے نام سے عوام میں جو علمی و عملی خرابیاں پائی جاتی ہیں ہم اس عقیدے کے نام سے نادانیاں کرنے والوں کی نادانیوں کو اس عقیدے کی طرف نہیں منسوب کرسکتے۔ کیا عوام کی نادانیوں کی وجہ سے ہم شیخ ابن عربی، مولانا جلال الدین رومی، مولانا عبدالرحمان جامی اور حضرت خواجہ باقی اللہ اور ان کے دہلوی خلیفہ اوّل خواجہ حسام الدین رضی اللہ عنہم کے ایسے بزرگوں کے دین و ایمان و تقدس پر حرف گیری کی جرأت کرسکتے ہیں؟ اگر نہیں اور واقعہ بھی یہی

ہے کہ نہیں، تو کیا اگر یہی بات جو عربی و فارسی میں مسلمان عارفوں نے کہی وہ مومن و مسلم اور یہی بات اگر سنسکرت یا ہندی وغیرہ زبانوں میں کہی جائے تو کہنے والوں کو نادان یا بے دین ٹھہرایا جائے؟

بہرحال مجھ علوم دین کے ابجد خوان کا یہ مقام نہیں کہ وحدت الوجود یا وحدت الشہود پر گفتگو کروں تاہم اتنا یقین ہے کہ ع

کس نہ کشود و نکشاید بحکمت این معمارا

زیادہ قیل وقال سے صرفِ نظر۔ مجھے وجد آگیا جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے ترجمۂ قرآنِ حکیم میں نَحْنُ اَقْرَبُ الیه الآیہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے حاشیے کے ذیل میں یہ شعر دیکھا کہ

جان نہاں در جسم و او در جاں نہاں
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

وحدت الوجود ہو یا وحدت الشہود ہمارے ایسے عوام صرف اتنا ہی جانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ "نام جدا کام جدا"! خالق خالق ہی ہے۔ مخلوق مخلوق ہی۔ عابد عابد ہی ہے۔ معبود معبود ہی۔ حاکم حاکم ہی ہے۔ محکوم محکوم ہی۔ حق تعالیٰ کی کنہ ذات تک کون پہنچ سکتا ہے۔ ہاں آیاتِ الٰہی سامنے ہیں۔ ہر کہ ومہ حسب استطاعت و توفیق و مذاق ان سے مستفید و مستفیض ہو سکتا ہے۔ رسوم و قیود کے مقیدوں نے اپنے اپنے حلقے میں آنے والوں کے لیے نعمار الٰہی کو خاص سمجھ لیا ہے۔ اور جو ان کے حلقے سے باہر ہیں وہ ان کے لیے پھل کی بجائے پتھر تجویز کر چکے ہیں۔ بقول خود وہ خاصانِ خدا ہیں اور دوسرے عوام کالانعام۔ وہ مقبول ہیں اور دوسرے مردود۔ حالانکہ ہے یوں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ کم سے کم اولاد آدم

کی مساوات کے لیے اچھا عقیدہ ہے۔

وحدۃ ادیان

وحدۃ ادیان کا تخیل اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس طرح آسمانی یا قدرتی نعمتیں عام ہیں اسی طرح روحانی نعمتیں بھی عام ہیں۔ جیسے خدا ایک ہے۔ خدا کی مخلوق بھی ایک ہے اور خدائی دین بھی ایک ہے۔ زبانیں بے شمار سہی مگر مدعائے کلام ایک ہے اور اسی کا نام کلمہ حق ہے۔ جو ایک ہے اسی کی طرف قرآنِ حکیم تمام دنیا کے اہلِ دل، اہلِ ضمیر اور اہلِ خرد اور تمام اہلِ کتاب کو بآوازِ بلند دعوت دیتا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

(آل عمران ۶۴)

اے پیغمبر تم یہود و نصاریٰ وغیرہ سے کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب، اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو۔ اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے یکساں طور پر مسلم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم نے عبادت کے وقت اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی

الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ
وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى
حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى
وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ
وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ج
وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ
وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَا
هَدُوْا ج وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْ
سَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ط
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (٢/١٧٧)

طرف (یا اسی طرح کی کوئی دوسری
بات ظواہر رسوم کی کرلی) نیکی کی
راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ
پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر،
آسمانی کتابوں پر اور خدا کے سب
نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور خدا
کی محبت کی راہ میں اپنا مال
رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور
مسافروں اور سائلوں کو دیتے ہیں
اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے خرچ
کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ
ادا کرتے ہیں اپنی بات کے سچے ہوتے
ہیں۔ جب قول وقرار کرلیتے ہیں تو
اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ مَنْ
اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝
قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى
اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ
وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا دین
چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ
نکالیں؟ حالانکہ آسمان وزمین میں
جو کوئی بھی موجود ہے۔ خوشی سے یا
ناخوشی سے مگر سب اسی کے حکم
کے فرمانبردار ہیں اور بالآخر سب
اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اے

رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ
وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ٥ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ
غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ
مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ
الۡخٰسِرِيۡنَ ٥

آلِ عمران (۳/۸۴ تا ۸۵)

پیغمبر تم کہہ دو ہماری راہ تو یہ ہے
کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور
جو کچھ ابراہیم۔ اسماعیل۔ اسحاق۔
یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل
ہوا ہے، اس پر ایمان رکھتے ہیں نیز
جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور خدا کے
تمام نبیوں کو ملا ہے اُس پر بھی
ہمارا ایمان ہے۔ ہم اُن رسولوں
میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں
سے جدا نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں
کسی کو نہ مانیں ۔ ہم خدا کے فرمانبردار
ہیں اُس کی سچائی جہاں کہیں بھی
اور جس کی زبانی بھی آئی ہو، سچائی
ہے اور ہم اس کی اطاعت کرنے
والے ہیں اور دیکھو جو کوئی اسلام
(فرمانبرداری حق) کے سوا جو تمام
رہنمایانِ حق کی تصدیق و پیروی کی
راہ ہے کسی دوسرے دین کا خواہشمند
ہوگا وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔
اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں
میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔
(ترجمان القرآن۔ مولانا آزاد)

یہی اصل دین ہے جو دنیا جہان پورب، پچھم، اتر، دکھن جہات کے لحاظ سے اور عربی، سنسکرت، عبرانی اور چینی وغیرہ زبانوں کے لحاظ سے ایک ہی تھا۔ ایک ہی ہے۔ ایک ہی رہے گا۔ رہیں فقہی جزئیات اور باریکیاں وہ مقامی اور وقتی تھیں۔ جب وہ باریکیاں کسی ایک دین کی طرف منسوب جماعتوں میں ایک نہیں، پھر بھلا دنیا جہان کے سارے مذاہب میں بالکل ہو بہو ایک کیسے ہو سکتی ہیں۔ کہیں اتفاق ہے، کہیں اختلاف۔ کہیں ملتی جلتی ہیں، کہیں زمین و آسمان کا فرق۔ وہ بدل گئی ہیں۔ بدلتی رہتی ہیں۔ اور حسب ضرورت ان میں کمی بیشی حک و اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ ایک جگہ ایک رنگ میں مل جاتی ہیں دوسری جگہ دوسرے رنگ میں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ وحدت ادیان کا مدار جزئیات کی یکسانیت پر نہیں بلکہ ازلی و ابدی حقایق کی وحدت پر ہے۔ جو سب جگہ ایک ہیں، یعنی وحدت انسانیت، وحدت الوہیت اور وحدت حقیقت اور حق کی اطاعت اور حق کی تلاش اور لگن اور اسی کے مطابق زندگی کی رفتار۔ یہی دین حق ہے اور یہی حق ایک ہے۔ کوتاہ نظر رنگوں کی رنگا رنگی اور لباسوں کی تراش وخراش اور آواز کے زیر و بم اور لب و لہجے میں ہی الجھ کے رہ گئے۔

تمام اُمتوں میں ظہور انبیاء و رسل

خالق اکبر رب العالمین نے اپنی ساری مخلوق کی مختلف اقوام میں مختلف زمانوں اور زبانوں میں مخاطب اقوام میں سے منتخب انسانوں کو ہم کلامی کا شرف بخشا اور مناسب طریقوں سے اپنا منشا سمجھایا۔

جیسے توریت و زبور و انجیل و قرآن خدائی پیغام ہیں ویسے ہی ایران و چین و ہند وغیرہ زمینوں میں خدا کے پاک بندے ظاہر ہوئے اور انھوں نے بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ سب کو ان کے رب کا پیغام مخاطبوں کی بولی میں سنایا کہ خدا ایک ہے، نسل آدم ایک ہے، ان کی ضروریات ایک ہیں، ان کے احساسات ایک ہیں۔ ان کی کمزوریاں ایک ہیں اور ان کے محاسن و کمالات ایک ہیں۔ چونکہ انسان طبعاً کمزور ہے اور حریص بھی۔ اس لیے نسل آدم میں بلا امتیاز من و تو عدل و انصاف سے کام لینے کے لیے میزان عدل قائم کی گئی اور چاہا گیا کہ انسانوں کے باہمی معاملات میں معدلت گستری سے کام لیا جائے۔ اپنے محبوب یعنی اپنے خدا سے محبت کی جائے یہ افراد کی پسند اور ان کے جذبات صحیح و میلانات درست پر رکھا گیا کہ یہ سب خدائی رنگ اور اذواق گوناگوں ہیں۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ مشورہ کیا اور دیا جاسکتا ہے۔ مگر رد و قبول میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ــــ لیکن، مختلف افراد اور مختلف طبقات اور گروہوں میں عدل قائم رہنا ہی چاہیے' اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا۔ کوئی فرد یا جماعت انسانوں ہی کے خودغرضانہ مفروضہ امتیازات کی وجہ سے اپنے مساویانہ انسانی حقوق سے محروم نہ رہے۔ اور نہ رکھی جائے۔ یہ کام عادل حکومت کے سپرد کیا گیا۔ کیونکہ صحیح معنوں میں حکومت وہی ہے جس کی نظر میں نظری اور عملی نقطۂ نگاہ سے اس کے زیر اثر سب افراد اور تمام طبقات برابر ہوں۔ حکومت عادلہ افراد اور گروہوں اور طبقات کے باہمی اختلافات، نزاعات میں بالکل غیر جانب دار رہے گی۔ حکومت کی غیر جانب داری

دکھاوے کی نہیں، حیلے کے طور پر نہیں، سچے دل اور پورے یقین سے ہوگی۔ ہم اسی کو سیکولرازم سمجھتے ہیں۔ اس میں حاکم بھی قانون سے ماوراء نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلقین سے بھی وہی سلوک ہوگا جو ملک کے ہر کس و ناکس کے لیے قانوناً جائز رکھا گیا ہو۔ ایسی حکومت میں کمزور حق دار، زور آور غاصب کے مقابلے میں طاقتور ثابت ہوگا۔ کیونکہ قانون کی مشین کمزور حق دار کی حامی اور طرفدار ہوگی۔ کسی تنازعے کا فیصلہ نسل، ذات، رنگ، گروہ بندی یا کسی مذہبی جنبہ داری کی بنا پر نہ ہوگا، بلکہ آئین عدل کے مطابق ہوگا۔ غیر جانب دار حکومت جو بھی فیصلہ کرے گی یہ تو ناممکن ہے کہ سب افراد اور سب فریق اس سے مطمئن ہوں مگر یہ ضرور ہوگا کہ آئین عدل و ناجانب داری اور بے نفسی و بے غرضی کی عدالت اور زندہ ضمیر کی شہادت ضرور اسی کے حق میں ہوگی، اور سیکولرازم کی یہی سب سے بڑی فتح اور سب سے بلند کامیابی ہے۔

اکبر کو بُرا کہنے والے

بدایونی نے اکبر کی طرف جن باتوں کو منسوب کیا ہے ان کا آئین اکبری میں ذکر نہیں۔ بدایونی کی تحریفات کی داستان آپ محترم شیخ محمد اکرام صاحب کے قلم سے اوپر پڑھ آئے ہیں۔ ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لی جائے ـــ اسی کے ساتھ عالم اسلام میں پیدا ہونے والی ماضی و حال کی تحریکات اور ان کی خصوصیات کا جائزہ لے لیا جائے، صاف ظاہر ہوگا کہ ماضی و حال میں بے شمار اصول و فروع اور اعمال و افعال وہی ہیں یا ویسے ہی ہیں جن کا وجود دوسری جماعتوں کا طرۂ امتیاز

اور روز مرہ کا کاروبار ہے۔ نقادوں نے دوسروں پر تنقید نہیں بلکہ جابجا ان کی تنقیص کی اور انھیں ہنسی میں اڑایا اور بھول گئے کہ دوسرے نقادوں نے ان کے کارناموں میں بھی ویسے ہی داغ د... دکھائے ہیں جو ان کے معتوبوں کو ان میں نظر آتے ہیں۔

اکبر، ابوالفضل اور ملّا بدایونی

عبادت خانے کی گفت و شنود اور تبادلۂ خیالات کے علاوہ اکبر اعظم کے دینی اور علمی کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اسلام تو خیر اسے ورثے میں ملی ہوئی دولت تھی دوسرے مذاہب و ادیان کی اہم کتابوں کا دربار کی علمی زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔ تاکہ مختلف الخیال لوگ باہم ایک دوسرے کی مذہبی اساسی کتابوں کا مطالعہ کریں اور ایک دوسرے کی خوبیاں پہچاننے کی کوشش کریں۔ اس کام کے لیے جن علماء کو انتخاب کیا گیا ان میں ایک ملا عبدالقادر بدایونی مرحوم و مغفور بھی تھے۔

اکبر نے بدایونی کی ادبی قابلیت کے ساتھ ان کی تنگ نظری کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں دربار سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار چاہا تھا کہ انھیں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مقبرے کا متولی بنا کر بھیج دے۔ ملا صاحب بھی اس عہدے سے خوش تھے۔ مگر جس وجہ سے انھیں اجمیر نہ بھیجا گیا وہ ان کی علمی کتابوں کے ترجمے کی قابلیت تھی۔ یہ بات ملا صاحب کی زبان ہی سے سنیے۔ فرماتے ہیں ایک بار اکبر نے ابوالفضل سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

"ما (اکبر) فلانے را کہ عبارت از فقیر (ملا عبدالقادر بدایونی) باشد۔ جوانی صوفی مشرب خیال می کردم۔ اما او چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیر رگ گردنِ تعصب او را نتواند برید"۔

جب اجمیر بھیجے جانے میں تاخیر ہوئی تو اکبر نے ابوالفضل سے کہا کہ:

"اگرچہ از فلانے (بدایونی) خدمت اجمیر ہم خوب می آید۔ اما چوں چیزہا را با در ترجمہ فرمائیم بسیار خوب دخاطر خواہ می نویسد۔ نمی خواہیم از ما جدا باشد"۔

(رود کوثر طبع چہارم ص۱۰۷)

ملا صاحب کا کمال یہ ہے کہ اکبر جو کوئی خدمت سپرد کرتا تھا تو وہ زمین بوس ہو کر (رود کوثر طبع چہارم ص۱۰۷ حاشیہ بحوالہ منتخب التواریخ جلد دوم ص۴۰۲-۴۰۱) یعنی سجدہ بجا لا کر قبول کر لیتے تھے اور گھر میں آ کر تنہائی میں اکبر کی بے دینی کا رونا شروع کر دیتے تھے اور اس گریہ پیہم کی تلخی ان کے افسانۂ تاریخی کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

ملا صاحب نے جن کتابوں کا دوسرے علمار کی معیت میں ترجمہ کیا۔ ان میں ویدویاس کی مہابھارت بھی ہے۔ جس کے مطبوعہ فارسی ترجمے کی ضخامت تین ہزار صفحات ہے۔ شاہی اشارے سے اس کا دیباچہ شیخ ابوالفضل نے لکھا تھا جو کتاب کے ۳۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس مقدمے میں ساری کتاب کا باب وار خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس کے طابع و ناشر منشی نول کشور مرحوم و مغفور نے اس مقدمے کو "مہابھارت مجلی تصنیف شیخ ابوالفضل علامی فہامی" کا عنوان دیا ہے۔ ملا صاحب اپنی نجی روداد

"منتخب التواریخ" میں ابوالفضل کو ملحد ظاہر کرتے ہیں اور وہ "محدود النظر علماء" کی آگہی و بصیرت کے لیے نئے نئے راستے نکالتا اور علمی آسانیاں فراہم کرتا ہے۔

یہ مقدمہ کئی کئی پہلوؤں سے قابلِ مطالعہ اور قابلِ غور اور ہماری بحث سے تعلق رکھتا ہے، خاص طور سے وہ حصہ جس میں مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی ہیں:

۱۔ اکبر کو احساس تھا کہ اس کی رعایا بظاہر مختلف العقائد اور متعدد زبانیں بولنے والے انسانوں پر مشتمل ہے اور ان میں شدید اختلاف ہے جس کی بنیاد بےخبری پر ہے۔

۲۔ خدا نے اپنے فیضِ عام ربوبیت سے سب کو ظاہر و باطن کی نعمتوں سے مالامال کیا ہے۔

۳۔ لیکن لوگ ہیں کہ زبانوں کی اجنبیت کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے دور رہتے ہیں۔

۴۔ بےخبری و بےعلمی کسی ایک طبقے سے خاص نہیں، سب طرف بےعلمی ہے اور سب طرف ضد و تعصب اپنا کام کر رہے ہیں۔ نہ اس سے ہندو بچے ہیں نہ مسلمان۔

۵۔ مثلاً مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ نسل آدم کی ابتدا کم و بیش سات ہزار سال سے

ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں میں ایسا
نہیں۔ عموماً مسلمان ہندوؤں کی کتب سے
ہی نہیں اپنے بزرگوں کی کتب سے بھی
بے خبر ہیں۔

۶۔ اکبر نے چاہا کہ مختلف مذہبی گروہوں کی مقدس
کتابوں کا ملک کی سرکاری اور عام فہم زبان
میں ترجمہ کرائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے
خیالات کو سمجھ سکیں۔

۷۔ ان علمی دینی حکیمانہ کتابوں کے ترجمے کے لیے
ایسے زبان داں مترجم جو بے تعصب، حق پسند
اور عدل و دانش سے آراستہ تھے منتخب کیے
گئے، اور انھوں نے یہ کام بحسن وخوبی انجام
دیا۔

۸۔ تکمیل کے بعد یہ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ تحفے
کے طور پر اس کی نقلیں دور دور کے صوبوں
میں لے جائی گئیں۔

۹۔ جو جماعت ترجمے کے لیے انتخاب کی گئی، جیسا
کہ اوپر ذکر ہوا ان میں ملا عبدالقادر بدایونی
بھی تھے۔ ان ملا صاحب کے متعلق ابوالفضل
کا حسن ظن دیکھیے اور ملا صاحب کے سوءِ ظن
کو ملاحظہ کیجیے جو آپ نے ابوالفضل کے خلاف

ظاہر کیا، ملا صاحب کا دور خاین اتنا چھپا ہوا تھا
کہ وہی بزرگوار جس کو ملا صاحب گھر میں بیٹھ کر
بے دین بتاتے تھے آپ نے اس سے اپنا
ظاہری برتاؤ ایسا رکھا کہ وہ آپ کو اخلاص مجسم
خیال کرتا رہا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پاکستانی پروفیسر
جس کے بیانات کو بے شک و ریب صدق خالص
ٹھہرا رہے ہیں، اسے اگر حق گوئی کا اتنا ہی شوق
تھا اور وہ اپنی دیانت و امانت پر بڑی سے بڑی
قسم بھی کھا سکتا تھا تو کیوں نہ اس نے ایک بار
بھی امیر و وزیر کے سامنے اپنی جنچی تلی دین دارانہ
مخلصانہ رائے بے خوفی و بے باکی سے ظاہر کر دی۔

سجادہ یا تخت

حضرت شیخ احمد سرہندی "پابند شرع" جہانگیری دربار میں بلائے گئے۔ آپ نے نام نہاد "جہانگیر" کو نہ سجدۂ عبودیت کیا نہ سجدۂ تعظیمی۔ پاداش میں گوالیار کے قلعے میں نظر بند رکھے گئے، کچھ عرصے بعد قلعے سے نکال کر شاہی لشکر میں ٹھہرایا گیا۔ آخر وہاں سے رخصت ملی اور کچھ نقد رقوم یعنوا نہائے مختلف دی گئیں۔ جنھیں اللہ کے فقیر نے قبول کر لیا۔ حضرت موصوف کے اس زمانے کے مکاتیب پڑھنے کی چیز ہیں۔ مگر جب آپ کی جانشینی خاندانی اور موروثی ہو گئی تو حضرت موصوف کے جانشین خواجہ محمد معصوم کی وفات پر ان کے وارثوں میں سے ہر ایک دعویدار تھا

کہ "قیوم" میں ہوں اور دنیا میرے سر پر قائم ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن وہ جس شان سے رہتے تھے، اس کا بیان کسی غیر سے نہیں ایک معتقد کی زبان سے سنیے:

"حضرت شیخ (سیف الدین) صاحب کے لیے سرہند میں دیبا کا خیمہ جواہرات اور مروارید سے ٹکا ہوا نصب ہوتا۔ جس کی چوبوں پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمے کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرداگرد نقیب اور چوب دار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لیے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ۔ شاہزادے اور امراء حاضر خدمت ہو کر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا نہ بیٹھتے۔"

(رود کوثر ص۵۳۲ بحوالہ روضۃ القیومیہ رکن دوم ص۱۴۲)

یہ شان اورنگ کے زمانے کے مجددی سجادہ نشین 'پابند شرع ہی نہیں معلم شرع مستجاب الدعوات بزرگوار کی تھی۔ اب اورنگ زیب کے پردادا اکبر کے روحانی مرشد اور مربی حضرت شیخ سلیم چشتی کے دو رنگ بھی قابل دید ہیں۔ آپ علوم ظاہری کے فاضل تھے۔ آپ نے کئی حج کیے تھے۔ آخری حج کر کے عرب سے:

"ہندوستان واپس آکر فتح پور سیکری کی پہاڑی پر

آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ بالعموم روزہ سے رہتے
اور مضعوف چیزوں سے روزہ افطار کرتے ۔ ہر روز
ٹھنڈے پانی سے غسل فرماتے اور کڑکتے جاڑوں
میں ایک پیراہن کے سوا کچھ نہ پہنتے۔ آخر آپ نے
شادی کی اور بادشاہ (اکبر) اور امراء کے
اعتقاد کی وجہ سے آپ کی ظاہری حالت بہت
بڑھ گئی۔ عمارتیں اور باغات اور چاہ تعمیر کروائے
بلکہ شیخ عبدالحق (محدث دہلوی) تو لکھتے ہیں کہ
آپ کی مجلس امراء اور اغنیا کے مشابہ تھی۔
"بعضی عادات مخالف شریعت کہ متعارفِ عوام
باشد نیز رو داد۔"

(اردو کوثر طبع چہارم ص۷۲-۷۱)

اس ہجری صدی کے ایک مجذوب عالم کے متعلق سنا ہے۔ (حقیقتِ واقعہ خدا کو معلوم ہے) کہ وہ پہلے دن سے آخر دم تک اسی خانقاہ میں مقیم رہے جس میں گاؤں سے آکر ڈیرا ڈالا تھا۔ آپ کی خوراک بھی وہی رہی جو قدیم سے تھی۔ یعنی جوار کی کھچڑی۔ البتہ خانقاہ سے ملحق ایک محل تعمیر ہوا جس میں آپ کی دوسری اہلیہ مع اپنے فرزند ارجمند کے تشریف رکھتی تھیں۔ جو خوش حال اور اونچے امراء مہمان ہوتے ان کا قیام و طعام محل سے متعلق ہوتا اور جو عوام ہوتے ان کا بسیرا خانقاہ کے احاطے ہی میں رہتا اور ان کی مہمانی سیدھی سادی ہی رہتی اور پہلی بیوی جو دیہاتی تھیں اور ان کے بطن سے جو فرزند تھے ان سے خدا جانے

کیا خطا سرزد ہوئی کہ ان کا ذکر اذکار کہیں نہیں سنایا گیا۔

پاکستان کے ایثار پیشہ علماء

یہ تو پرانی کہانیاں ہیں۔ اپنے زمانے کی روداد آپ کے سامنے ہے۔ مسٹر محمد علی جناح مرحوم نے "ہندو مسلم دو قومیں ہیں" کا نعرہ لگا کر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے تین ٹکڑے کرا دیئے۔ ایک بھارت۔ دوسرا مشرقی پاکستان تیسرا مغربی پاکستان۔ پاکستان یعنی ایک ایسا ملک جس کا سر کہیں تھا اور دھڑ کہیں۔ پھر ۱۹۷۱ء میں جنرل آغا یحییٰ خاں قزلباش نے اپنی نادری شان دکھائی۔ پاکستان کے دونوں حصوں کو جو بُعد مسافت کے لحاظ سے ہزار بارہ سو میل ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود آئینی اور قانونی طور پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نام سے ایک ہی ملک کہلاتے تھے۔ ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ بنا دیا۔ اور مشرقی بنگال میں قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ مشرقی بنگال نے "بنگلہ دیش" کے نام سے اپنی الگ ایک آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور عرب ریاستوں کو چھوڑ کر جن کی خود باہم ایک دوسرے سے نہیں بنتی ساری دنیا نے اسے تسلیم کر لیا۔ یہ نتیجہ تھا سالہا سال کی یک طرفہ لوٹ کھسوٹ اور ۱۹۷۱ء کے قتل عام اور غارت گری کا۔ پاکستان کی حکومت، اس نعرے اور اعلان پر قائم کی گئی تھی کہ وہاں کتاب و سنت کی فرمان روائی ہوگی۔ مگر اس ادعا کے باوجود وہاں ظہور میں کیا آیا۔ وہ مجھ سے نہیں فاضل دیوبند علامہ مولانا سعید احمد ایم۔ اے مدیر شہیر مجلہ "برہان" دہلی کی زبان قلم سے سنیے۔ موصوف اپنے رسالے "برہان" دہلی

کی اشاعت جنوری ۱۹۷۲ء میں "نظراتِ بنگلہ دیش" کے عنوان سے صفحہ ۴ پر اس انقلاب کے اسباب بیان فرماتے ہیں کہ:

"مغربی پاکستان کے اربابِ سیاست کو سمجھنا چاہئے تھا کہ (سابقہ) مشرقی پاکستان اُن سے ایک ہزار میل سے زیادہ دور پڑا ہوا ہے۔ اُن میں اور مغربی پاکستان کے لوگوں میں ایک مذہبی رشتہ (جس کی نسبت واقعات نے ثابت کردیا کہ یہ سب سے کمزور اور ناقابلِ اعتبار رشتہ تھا) اس کے علاوہ کوئی اور امر مشترک نہیں ہے۔ اور اگرچہ پاکستان کی معاشیات میں سب سے زیادہ حصہ مشرقی پاکستان کا ہے۔ لیکن خود یہ لوگ پس ماندہ ہیں اس بنا پر خاص مشرقی پاکستان کے ساتھ معاملہ محبت اور یگانگت، عدل و انصاف اور دلجوئی کا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہوا۔ پاکستان کیا بنا؟ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اربابِ حرص و آز اور مفاد پرستوں کی بن آئی۔ ہر شخص جلبِ زر اور عیش و عشرت کے سامانوں کو زیادہ سے زیادہ فراہم کرنے کی فکر میں غرق ہوگیا۔ حد یہ ہے کہ جن علماء کی زندگی مدارس میں بوریہ نشینی کرتے گزری تھی، کراچی اور لاہور نے ان کو بھی عالیشان کوٹھوں، موٹر اور وسیع کاروبار

کا مالک[1] بنا دیا۔ اس افراتفری میں انھوں نے
تمام اصولوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو ایک
نوزائیدہ قوم کی تعمیر سیرت کے لیے ضروری
ہیں"۔ (برہان ۔ دہلی ۔ جنوری ۱۹۷۲ء)

سچ ہے ؎

بادہ ہا خوردن و آسان نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

ملا عبدالقادر بدایونی مرحوم نے اپنے عہد کے شاہ و گدا کسی کو "اچھوت" (UNTOUCHED) نہیں چھوڑا۔ جو لوگ ان کی نگاہ میں معتوب ہیں۔ ان کو تو کیا اور کیوں بخشتے۔ جن سے نہال بھی ہیں ان کے بھی ایسی ایسی چٹکیاں لی ہیں کہ ان کے اخلاقی بدن پر جا بجا نیلے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ ملا صاحب کی افتاد مزاج دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ اکبری شیخ الاسلام اور صدر الصدور[2] اور دوسرے صوفیا اور علما و حکما وغیرہ

---

[1] حضرت مولانا سعید احمد مدظلہٗ سے معافی مانگتے ہوئے عرض ہے کہ اگر ان علما نے ناجائز ذرائع سے دولت و ثروت سمیٹی ہے تو ان پر افسوس، مقام عبرت ہے، لیکن اگر انھوں نے جائز قانونی ذرائع سے تجارت کی اور نفع کمایا تو ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ "بوریہ نشینوں" سے یہ توقع کہ وہ ہمیشہ بوریہ نشین ہی رہیں گے اور پیش آمدہ جائز مواقع سے بھی فائدہ نہ اٹھائیں گے ایک آدھ بزرگ سے توقع کی جا سکتی ہے، اکثریت سے نہیں۔ شہاب

[2] اکبری دور کے صدر الصدور ملا عبدالنبی ہی کو لیجیے (باقی اگلے صفحے پر)

اخلاقی طور پر اتنے بدصورت ہوں گے جتنی بدصورت تصویر ان کی ملا صاحب نے بنائی ہے۔

اکبر۔ شیخ مبارک۔ فیضی اور ابوالفضل مرحومین یا اس عہد کے دوسرے ذی اثر اور ذمہ دار لوگوں سے ضرور غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ مذہبی بھی۔ سیاسی بھی۔ بڑی بھی۔ چھوٹی بھی۔ معقول بھی۔ نامعقول بھی، اور کون آدم زاد ہے جس کے نامۂ اعمال میں بھول چوک کا خانہ ہی نہ ہو۔ لیکن اگر ذرا کوشش کی جائے تو وہ غلطیاں جو ان کی طرف منسوب کر کے بڑھائی، چکائی اور

(سلسلہ گزشتہ صفحہ) ان کی مداحی اور قداحی کے نمونے ملا صاحب بدایونی ہی کے قلم سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ ملا صاحب صدرالصدور کی مدح میں فرماتے ہیں:

> "جب منصب صدارت کو پہنچے تو ہر جگہ مدد معاش میں زمین دی۔ وظائف مقرر کیے۔ اوقاف قائم کیے۔ کسی اور بادشاہ کے زمانے میں ایسا صدر نہ ہوا ہوگا۔ انھوں نے جتنے اوقاف قائم کیے۔ کسی اور صدر نے اس کا دسواں حصہ بھی نہ کیا ہوگا۔"
>
> (بزم تیموریہ حصہ اول طبع اول مطبوعہ ۱۹۴۲ء بحوالہ منتخب التواریخ جلد ۳ ص۷۰)

لیکن وہ (ملا بدایونی صاحب) یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ان کا طرزِ عمل بدل گیا۔ (بزم تیموریہ ص۲۱۱)

یعنی یہ "جس وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر بیٹھ جاتے

(باقی اگلے صفحے پر)

اچھالی جا رہی ہیں۔ وہی یا ویسی ہی غلطیاں کسی نہ کسی مسلمہ بزرگوار کی طرف منسوب دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہیں۔ بہرحال ان کے دور کو دیکھو اور ان کی مجبوریوں پر غور کرو۔

اکبر کی امامت وآمریت

محدود ومخصوص اصطلاح سے قطع نظر عالم اسلام میں ابتدا سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جو شخص حاکم ہے، وہی مفترض الطاعۃ امام ہے۔ مملکت

(سلسلہ گذشتہ صفحہ) تو بڑے بڑے امراء اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے ان کے پاس آتے وہ ان کی بہت تعظیم کرتے اور جب وہ حد سے زیادہ الحاح وعاجزی کرتے تو ان مدرسوں کو جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے تقریباً سو بیگھے کی اراضی منظور کرتے۔ باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض ہوتے قلمزد کر دیتے۔ اس کے مقابلے میں جاہلوں۔ کمینوں بلکہ ہندوؤں کو اچھی اچھی زمینیں عطا کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کی بدولت علم اور علماء دونوں کی قدر وقیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔ (بزم تیموریہ حصہ اول ص۲۱۱ بحوالہ منتخب التواریخ جلد ۲ ص۲۰۵)

(باقی اگلے صفحے پر)

اسی کی ہے، خطبہ اور سکہ اسی کے نام کا ہے۔ اکبر ہی کو دیکھ لیجیے، ہم عصر علماء کی بڑی اکثریت نے اکبر کی امامت فی الارض کو تسلیم کر لیا تھا اور اسی کا امر بھارت کے طول و عرض میں نافذ تھا۔[له] مسائل حکومت اور اختلافی مسائل افراد رعایا میں اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ تھا کیونکہ آئین و قوانین

(سلسلہ گذشتہ صفحہ) ملا بدایوانی صاحب بھی عالم تھے ان کی بھی:-

اصلی خواہش یہ رہی۔ ۔ ۔ ۔ کہ مدد معاش کے طور پر کوئی جاگیر مل جاتی۔ وہ نوکری نہ کرتے۔ بلکہ توکل و قناعت کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ کر علمی کاموں میں لگے رہتے۔ (منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۱۴۷-۲۷۱)

لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی مجبوراً ملازمت کر لیتے پھر جس کے بدلے میں ان کو جاگیر ملتی رہتی"

(بزم تیموریہ جلد اول ص۲۰۵ بحوالہ منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۳۴۲)

فرمایئے اگر ملا صاحب، صاحب اقتدار اصحاب کے خلاف شعلہ فشانی نہ فرمائیں تو کیا کریں۔ منقولہ بالا عبارت میں علماء کے مقابلے میں جن لوگوں کو زمینیں دی جاتی تھیں ان میں اکثریت کے مستحق علماء سنسکرت بھی ہوتے تھے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ملا صاحب ان کا ذکر کس برے طریقے سے کرتے ہیں مسلم و غیر مسلم میں یہی امتیازی برتاؤ تھا جس کو اکبر اور اس کے متنوع الفکر علماء وزراء دور کرنے کے درپے تھے۔ ان کی یہی خطا تھی جسے بدایونی صاحب اور ان کے مداح معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ شہاب۔

له۔ بھرے دربار میں "زمین بوس" ہو کر حکم بجالانے والوں کا (باقی اگلے صفحہ پر)

نوشتہ "صامت" ہیں ان کے منشار کا ظہور جس صاحب امر یا آمر بالاتفاق یا امیر یا امام عادل کے معدلت گسترانہ احکام کے ذریعے ہوتا ہو، وہی امام ہے۔ انہی معنی میں جلال الدین محمد اکبر (مرحوم و مغفور) خلیفتہ اللہ فی الارض اور امام مفترض الطاعۃ تھا۔ صاحب امر تھا۔ اپنی مملکت میں تنازعات کا آخری فیصلہ اسی کی سوجھ بوجھ، ہاں اور نہیں پر منحصر تھا۔ دنیاوی یا مادی سیاست کے لیے سیاسی اقتدار لازمی ہے، وہ اکبر کو حاصل تھا، روحانی امامت تنازع کی چیز نہیں۔ ماننے والے مانتے ہیں، نہ ماننے والے خواہ مخواہ بگڑتے ہیں۔ اس کے لیے سیاسی اقتدار لازمی علامت نہیں اگر روحانیت کے کسی امام کو سیاسی اقتدار حاصل بھی ہو تو اسے مستزاد سمجھیے۔ نہ ہو تو روحانی امامت سیاسی اقتدار کی محتاج نہیں، روحانی امامت ظاہری شکست میں بھی ہاتھ سے نہیں جاتی، کم سے کم ماننے والوں کی نظر میں۔ اور مادی یا سیاسی قیادت و امامت خلافت فی الارض ظاہری

(سلسلہ گذشتہ صفحہ) گھر کی کال کوٹھری کی تنہائی میں اکبر کو کافر و مرتد و بے دین و ملحد کہنا کوئی سند نہیں۔ اسی طرح جونپور کے ایرانی قاضی ملا محمد یزدی کا اکبر کے خلاف فتوائے تکفیر وغیرہ اس لیے سند نہیں ہو سکتا کہ یہ بزرگوار وہی ہیں جنھوں نے ایران سے آتے ہی اکبر کو صدیق اکبر اور فاروق اعظم اور دیگر اجل اصحاب رسول کی تکفیر و تفسیق کی راہ دکھائی تھی (رود کوثر ص 19 بحوالہ بدایونی و دین الٰہی ص ۲۲۹) بعد میں اگر انہی یزدی ملا صاحب مرحوم نے اکبر کے خلاف فتویٰ دیا اور علم بغاوت بلند کیا تو اس کے سوا ان سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ — شہاب

شکست کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے۔

مدعیان مقام عرفان

سارے عالم اسلام ہی میں نہیں۔ اسی ہندوستان میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی رنگ میں مجددیت، محدثیت، مہدویت، ماموریت من اللہ، قطبیت ابدالیت یا کشف وکرامت والے خدا رسیدگی اور خدانمائی کے مدعیوں کی کمی نہیں رہی۔ کسی کی سُنی گئی اور کسی کی سُنی اَن سُنی کردی گئی۔ کسی کا چند دن چرچا رہا اور کسی پر تالی پٹ گئی۔ کوئی لالۂ صحرا کی طرح تنہائی میں کھلا اور مرجھا بھی گیا اور اس کی جھلک دیکھنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اور کسی نے مور کی طرح جنگل میں روحانی وجد کیا نہ کسی نے اس کا وجد دیکھا نہ اس کی جھنکار سنی۔ انہی میں سے اگر ایک اکبر بھی ہو جس کا وقت وبخت نے ساتھ دیا، وہ گیا بات گئی، تو اس پر اظہارِ حیرت کیوں کیا جائے۔ اس کے وقت میں کسی نے سچے دل سے کسی نے یوں ہی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور کسی نے گردن تو ہلائی۔ مگر اس کا راز نہ کھل سکا کہ اس جنبش کا مطلب کیا تھا۔ مگر اس کا انکار کون کرسکتا ہے اور تاریخ اسلام کے اس نوشتہ کو کون مٹاسکتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا "امام" با اقتدار تھا۔ رتق وفتق اور معاش ومعدلت کی زمام انتظام اسی کے قبضۂ اختیار میں تھی اور اسی کے اشارۂ چشم پر ریاست وسیاست کے نقشے بنتے بدلتے یا مٹتے تھے۔

قرآن ومذاہب عالم کے معابد ومنادر

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ　　اور دیکھو، اگر اللہ بعض آدمیوں کے

بَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○

(الحج ۲۲/۴۰)

ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کرتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کرے گا۔ ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں۔ وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔

(ترجمان القرآن جلد دوم)

قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد کتنا پُرحکمت ہے کہ خدا کی بندگی کسی جگہ، کسی نام کے مکان اور کسی زبان میں کی جا رہی ہو، اس نام کا احترام اس مقام کا احترام سب انسانوں کا فرض اولین ہے۔ "دربار صاحب"، گوردوارہ، پوجا ستھان، مندر، گرجا گھر، چرچ، کلیسا، تکیہ، خانقاہ، مسجد وغیرہ وغیرہ عمارتیں اگرچہ سب کی سب اینٹ پتھر ہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس ذات بے ہمتا کی نسبت سے پاکیزہ اور لطیف

انسانی جذبات اور پاکیزگی قلب کی مجسم موجیں ہوتی ہیں جو مختلف عبادت گاہوں کی صورت میں مجسم ہوگئی ہوتی ہیں۔ ان کی شکست وریخت اینٹ پتھر کی شکست وریخت نہیں ہوتی بلکہ دلوں کی شکست وریخت ہوتی ہے اور ٹوٹے دلوں کا جوڑنا آسان نہیں ؏

دل را شکستہ نہ گوہر شکستہ

اس لیے ہر "انسان" کا جی ہاں ہر "انسان" کا فرض ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے معابد کا اتنا ہی احترام اور ویسی ہی جی جان سے حفاظت کرے جیسی اپنی محبوب عبادت گاہ اپنی مسجد اپنے مندر اور اپنے گرجا اور گوردوارہ کی حفاظت کرتا ہے۔ یا پسند کرتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے معبد کی حفاظت و احترام کریں —— مگر ——

محمد فاتح اور سینٹ اباصوفیہ

افسوس تاریخ معلوم کے ہر دور میں مذہب کے نام یا محض قوت کے اظہار یا کسی لالچ سے ایک دوسروں کے معابد میں توڑ پھوڑ یا ان میں ادل بدل کی گئی۔ آپ خوشی منائی گئی دوسروں کو خون کے آنسو رلایا گیا۔

اس وقت حضرت علامہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ کی کتاب "مسلمانوں کا عروج وزوال" میرے سامنے ہے اس کے صفحہ ۱۳۵ پر حضرت موصوف فتح کے بعد سلطان محمد فاتح کے قسطنطنیہ میں داخلے کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح بھی اپنے وزرار

داعیان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ مشہور گرجا
اباصوفیہ کے دروازے پر پہنچ کر اذان دلوائی اور
ظہر کی نماز پڑھی جس کے بعد یہ کنیسہ جامع مسجد میں
تبدیل ہوگیا۔"

یہ گرجا کے دروازے پر اذان دلوانا اور پھر وہاں نماز پڑھنا اور پھر اس کنیسہ کا جامع مسجد میں تبدیل ہوجانا کیا تھا؟ قرآن حکیم کی آیت بالا کو پڑھیے۔ اور سلطان کے اس عمل نیک کو دیکھیے اور پھر خود فیصلہ فرمائیے کہ یہ جو کچھ بھی ہوا کس مد میں داخل ہوگا۔ دلداری کی مد میں یا دل شکنی کی مد میں؟ یا معابد کے ناموں کی ادلا بدلی یا ان میں طریق عبادت کی ادلا بدلی بیرونی ملکوں ہی میں نہیں ہمارے ملک میں بھی ہوتی رہی ہے اور تعجب ہے کہ ایسی غلطیاں یا کارنامے دونوں کی طرف منسوب ہیں۔ دونوں فریق نے اپنی اپنی کارروائی کو سراہا یا حق بجانب ٹھہرایا اور دوسرے فریق کے کرتوت کو اچھالا اور شاخسانے نکالے اور رنگا رنگ افسانے تراشے۔

کروکشیتر کا تالاب اور اس کے مسجد و مندر

چنانچہ ہمارے فاضل نوجوان فاضل تاریخ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنی کتاب "دین الہٰی" کے ص۱۲ پر بدایونی کے بیان کی تائید میں حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی کے حوالے سے سلطان وقت (جہانگیر؟) کے عہد کی مسلمانوں کی شکایات کے سلسلے میں جو نقل کیا ہے اس کی پوری عبارت یہ ہے کہ:

"ناچار اسلام ضعیف گشتہ کفارِ ہند بے تحاشی
ہدم مساجد می نمایند و در آنجا تعمیر معبد ہائے
خود می سازند در تانسیر دردن حوض کر کھیت
مسجدی بود و مقبرہ عزیزے آنرا ہدم کردہ بجائے
دیہرۂ کلان راست ساختہ اند"

اصل مکتوبات کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مکتوبات کے مصحح جناب مولوی نور احمد پسروری ثم امرتسری مرحوم "دیہرہ" پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ:

"معبدِ قوم سکھ کہ پیروانِ نانک اند کہ بانی
مذہبِ ایشان است"

(مکتوبات امام ربانی دفتر دوم حصہ ہفتم۔ مکتوبات نود و دوم ص ۹۳
مطبوعہ مطبع روزبازار امرتسر مطبوعہ ۱۳۳۲ھ)

حضرت مجدد کی منقولہ بالا عبارت سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ اسلام ضعیف ہوگیا۔ ۲۔ کفارِ ہند کی جراتیں بڑھ گئیں۔ ۳۔ غیر مسلم مسجدیں ڈھاکر ان کی جگہ اپنے معبد بنا رہے ہیں۔ ۴۔ چنانچہ کروکشیتر (کرکھیت) کے حوض میں جو ایک مسجد اور کسی عزیز کا مقبرہ تھا انھیں توڑ کر ان کی جگہ ایک بڑا ڈیرا کھڑا کر دیا گیا۔

جیسا کہ آپ ڈیرہ کے لفظ کے حاشیے میں دیکھ آئے ہیں۔ "ڈیرہ" کا تعلق سکھ مذہب سے بتایا گیا ہے اور کروکشیتر کے تالاب یا حوض کا تعلق سکھوں کے مذہب کی نسبت زیادہ قدیم ہندو دھرم سے ہے۔ اور سکھوں کا مقدس معبد "دربار صاحب" شری گرو ارجن دیو نے امرتسر میں تعمیر کیا اور اس کا سنگ بنیاد جیسا کہ مشہور ہے، حضرت میاں میر نے

رکھوایا گیا تھا۔ خیر فی الحال بحث اس سے نہیں، بحث کردکشیتر کے حوض یا تالاب اور اس کے اندر بنے ہوئے مسجد و مقبرہ و مندر سے ہے۔ اور کردکشیتر کے اسی تالاب کا سوال لودھیوں کے زمانے میں بھی اٹھا تھا۔ "تاریخ افاغنہ" موسوم بہ "تاریخ شاہی" میں سکندر لودھی کے آغاز شباب کا ایک واقعہ یوں لکھا ہے:

"(سکندر) روزی فرمود باید بتھانیسر رفتہ کہ کہیت را بخاک انباشتہ بائمہ آنجا در وجہ معاش دہیم۔ ملک العلماء آں عہد حاضر بود از شاہزادہ پرسید کہ در آنجا چہ چیز باشد۔ فرمود کہ حوضی است کہ ہندوان از ہزار در ہزار کردہ بعد برائے غسل می آیند۔ گفت از کیٔ بنیاد این شدہ است۔ شاہزادہ فرمود کہ از سالہائے دراز این بدعت برپا شدہ۔ باز ملک العلماء گفت۔ پادشاہان پیش از شما چہ کردند گفت ہیچ نہ۔ گفت این بار بر شما نیست چرا کہ پیش پادشاہانِ اسلام بایں نپرداختند۔ ازیں سخن شاہزادہ تافتہ شدہ فرمود عجب علماء این زمانہ اند۔ الغرض (سکندر) در آغاز جوانی این چنین در ذمہٗ دینِ اسلام متعصب بود۔"

(تاریخ شاہی مصنفہ احمد یادگار شائع کردہ رویل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال صفحہ ۳-۲۱)

عبارت بالا سے ظاہر ہے کہ زمانۂ قدیم سے سکندر لودھی کے زمانے تک

کروکشیتر کا یہ مقدس تالاب ہندوؤں ہی کا تیرتھ تھا۔ اور انہی کے قبضے و تصرف میں رہتا چلا آیا تھا اور سکندر نے غلط قسم کی مذہبی عصبیت سے چاہا تھا کہ اسے ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر اور ہندوانہ آثار مٹا کر اور مٹی سے پاٹ کر مقامی مساجد کے بانگیوں اور اماموں میں وجہ معاش کے طور پر تقسیم کر دے۔ لیکن وقت کے ملک العلماء نے (جن کا نام مولانا عبداللہ تھا) سکندر کو اس حرکت سے روک دیا کہ وہ کام جو تم سے پہلے بادشاہوں نے نہیں کیا تم کیوں کرو اور نئی الجھنیں پیدا کرو۔ اور سکندر کو حق گو ملک العلماء کے سامنے جھکنا پڑا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تالاب میں ایک مسجد اور کسی نامعلوم بزرگ کی قبر جیسی عمارتیں کیسے اور کہاں سے آگئیں؟ وہاں جو کچھ تھا ہندوؤں کا تھا۔ تالاب بھی اور اس کے اندر کا مندر بھی۔ کیوں نہ حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیوں نہ گمان کیا جائے کہ سکندر سے اکبر یا جہانگیر کے زمانے کے بیچ کسی وقت کسی زور آور نے وہاں کے قدیم مندر کو مسجد اور کسی سادھو سنت کی سمادھی کو کسی فقیر کے مقبرے کا لباس پہنا دیا ہوگا اور حضرت مجدد کے زمانے میں دونوں چیزیں کسی طرح ایک غلطی کی اصلاح کے لیے یا لوگوں کی دھاندلی سے دونوں عمارتیں اصل وارثوں یعنی ہندوؤں کی طرف منتقل ہوگئی ہوں گی۔ اور اسی کو حضرت مجدد اسلام کا ضعف اور ہندوؤں کا غلبہ قرار دے کر احتجاج کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کا اعتقاد یہی تھا کہ غلبہ بہرحال مسلمانوں ہی کا رہنا چاہیے تھا۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ غلط اٹھا ہوا قدم پیچھے ہٹا لینا ہی حق پرستی ہے۔ بہرحال جب تک تحقیق نہ ہو ساری بحث قیاسی ہے۔

حضرت مجدد کی فریاد

اسی مکتوب میں بعض اور شکایات کے ذکر کے بعد حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ:

"ہیچ کس از زبونی اسلام منع آن نمی تواند بود۔
افسوس صد ہزار افسوس بادشاہ وقت از ماست
دما فقیران باین زبونی وخرابی۔ باکرام واعزاز این
صاحب دولتان (یعنی بادشاہان) اسلام رونق
داشت وعلماء صوفیہ معزز ومحترم بودند۔ وبتقویت
اینہا در ترویج شریعت می کوشیدند۔"

(دفتر دوم مکتوبات امام ربانی حصہ ہفتم ص۹۷)

یہ حالت اکبر کے دور کی ہو یا جہانگیر کے دور کی، ملا عبدالقادر بدایونی ہی نے عہد اکبری کے علماء اور صوفیاء کے احوال کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچ رکھا ہے جسے دیکھ کر "دین الٰہی" کے فاضل مورخ مصنف کو بے اختیار اعلان کرنا پڑا کہ:

"آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" (دین الٰہی ص۳)

کاش ملا بدایونی گھر میں بیٹھ کر صاحب دربار اور اہل دربار کے بھیانک کارٹون بنانے اور علمی دربار میں "پینترے" بدلنے کی بجائے بھرے شاہی دربار میں نعرۂ حق مارتے اور پھانسی پا جاتے اور اسی طرح حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے نجی مکاتیب میں شاہ اور شاہ رس لوگوں کے شکوہ و شکایت لکھنے کے بجائے کم سے کم جونپور کے قاضی شیعہ

عالم ملا محمد یزدی کی طرح اکبر یا جہانگیر کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے اور دنیا جہان کے اہلِ دل اور ان کی طرف سے مذہبی یا سیاسی غلط فہمیوں میں مبتلا لوگ ان کے رفیع مقامِ عرفان کی بندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینے پر مجبور ہو جاتے —— بہر حال ——

تیمور اور حضرت مجدد

اسی مکتوب میں حضرت مجدد صاحبقران ۔ دین پناہ ۔ شریعت دستگاہ ۔ صوفیوں کے خاک پا امیر تیمور کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ :

"شنیدہ ام کہ روزی صاحبقران امیر تیمور علیہ الرحمۃ بکوچہ بخارا میگذشت ۔ اتفاقاً درویشانِ خانقاہِ خواجہ نقشبند قدس سرہٗ درآن کوچہ گلیمہائے خانقاہِ خواجہ رامی افشاندند واز گرد پاک می کردند ۔ امیر از حُسن شعار مسلمانی کہ داشت درآن کوچہ توقف فرمود تا گردہائے خانقاہ راعبیر وصندلِ خود ساختہ ببرکات وفیوضِ درویشان مشرف گردد ۔ مگر بایں تواضع وفروتنی کہ باہل اللہ نمودہ بود بحسنِ خاتمہ مشرف گشت ۔ منقول است کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ بعد از وفات امیرمی فرمودند ۔ تیمور مرد ایمان برد ۔"

(دفتر دوم مکتوبات امام ربانی حصہ ہفتم مکتوب نود و دوم ص۹۲)

حضرت شیخ مجدد سرہندی کے محولہ بالا مکتوب گرامی سے ظاہر ہے کہ صاحبقران

امیر تیمور کا نشاء مسلمانی کس کیفیت کا تھا اور وہ کس طرح خاکِ خانقاہ حضرت خواجہ نقشبند کو عبیر و صندل یقین کرتا تھا اور وقت کے مہبط الہام حضرت خواجہ نقشبند کو اس کی نجات اخروی کی کن خوبصورت لفظوں میں بشارت دی گئی تھی ــــ آیئے ــــ اب حضرت مجدد کے انہی ممدوح کی واقعاتی تصویر اور کارنامے حضرت علامہ مولانا سعید احمد مدظلہ العالی کی کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں ملاحظہ فرمایئے۔ جو آپ نے ہندوستان کے مشہور مورخ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے ایک قابلِ قدر مضمون سے لیے ہیں ہم اس اقتباس میں سے بھی ضروری حصہ نقل کریں گے۔ جو یہ ہے:

تیمور کے خونی کارنامے

"۸۰۰ھ میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو یہاں تغلقوں کی حکومت جانکنی کی حالت میں تھی۔ مگر اسلام اور اسلامی عظمت و اقتدار کو کوئی خطرہ نہ تھا (مسلمانوں کا عروج و زوال صـ۱۲۹) تیمور ہردوار میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ بایزید یلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی قیصر روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی مع خط پہنچا کہ بایزید کے پاس آپ کے مفرور مجرم سلطان احمد اور قرا یوسف ترکمان راحت و آرام اور عزت

واحترام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں آپ
کی بڑی بے عزتی ہے (صفحہ ۱۲۹-۱۳۰) آپ اس طرف
آئیں اپنی سرحدوں کو بچائیں اور ہم کو بھی اس
مصیبت سے نجات دلائیں۔ تیمور سے توقع تھی کہ
وہ قیصر کی درخواست کا ایسا ہی مایوس کن اور
مسکت جواب دیتا جیسا کہ ساڑھے سات سو برس
پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے قیصر روم کو خط لکھا تھا
کہ اگر تیرے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ کے لشکر کو
حرکت کرنی پڑی تو سب سے پہلا سردار جو علی کے
جھنڈے کے نیچے تجھ پر حملہ آور ہوگا وہ معاویہ ہوگا
لیکن تیمور جذبۂ رقابت پر غالب نہ آسکا، نیز سلطان
احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کے بایزید کی
پناہ میں چلے جانے کو برداشت نہ کر سکا، وہ ہندوستان
سے فوراً چل پڑا۔ راستے میں ایک لاکھ ہندوستانی
قیدیوں کو جو بارِ خاطر یا گراں باریٔ سفر کا موجب
تھے۔ بجائے اس کے کہ آزاد کر دیتا قتل کر ڈالا (صفحہ ۱۳۰)
.... بایزید کی سرحد پر پہنچ کر بایزید کو جو قسطنطنیہ کا
محاصرہ کیے ہوئے تھا ایک تہدیدی خط لکھا کہ
ہمارے مفرور مجرموں کو فوراً ہمارے پاس بھیج دو۔
بایزید نے پناہ گزینوں کو دینے سے صاف انکار کر دیا۔
۸۰۳ھ میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے بایزید کی

علاقوں میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں بایزید کا بڑا لڑکا ارطغرل صوبے دار تھا، مارا گیا اور سیواس فتح ہو گیا۔ تیمور نے اس جنگ کے چار ہزار (مسلمان) ترک قیدیوں کے ساتھ یہ انسانیت سوز برتاؤ کیا کہ انھیں زندہ دفن کرا دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سنگ دلی اور وحشت اور بربریت کا ایک ایسا ہولناک مظاہرہ تھا جس کی نظیر خود تاتاریوں کے مظالم میں بھی نہیں مل سکتی (ص ۱۳۰) تیمور سیواس سے بڑھ کر انگورہ کے میدان میں اپنی سات آٹھ لاکھ فوج کے ساتھ داخل ہو گیا۔ بایزید نے ایک لاکھ کے ساتھ اپنے سے سات گنا زیادہ تیموری فوج سے مقابلہ کیا۔ بایزید کو اس جنگ میں شکست فاش ہوئی اور وہ اپنے بیٹے موسیٰ کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ آٹھ مہینے تیمور کی اسارت (قید) میں رہنے کے بعد اس کو قید ہستی و زندان آہنی (بایزید کو لوہے کے پنجرے میں رکھا جاتا تھا) دونوں سے بیک وقت رہائی ملی۔ بایزید کے مغلوب و اسیر ہونے سے یورپ میں اسلام کے روز افزوں اقتدار کو سخت نقصان پہنچا۔ لیکن اگر تیمور شکست پا کر اسیر ہو جاتا تو صرف خاندان تیموری کو نقصان پہنچتا مگر اس کو براعظم ایشیا میں

کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

(مسلمانوں کا عروج و زوال صـ۱۳۱)

یہ ہیں صاحبقران تیمور، موصوف کے دونوں رنگ آپ کے سامنے ہیں. ایک "نشا مسلمانی" سے سرشاری کا یہ عالم کہ ایک بزرگ کی خانقاہ کے قالینوں کی دھول میں کھڑے نہارہے ہیں اور صاحب خانقاہ سے نجات کی بشارت پارہے ہیں اور دوسرا رنگ یہ کہ ایک لاکھ معذور و مجبور و مسجون انسانوں کو ترحماً چھوڑ دینے یا غلام بنا لینے کے بجائے قتل عام کا حکم دیتے اور ان کو اپنے ہی خون میں تڑپتے اور ڈوبتے دیکھتے اور ٹس سے مس نہیں ہوتے. تیمور کو دعویٰ ہے کہ وہ اس قرآن پر یقین رکھتا ہے جس میں نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے پر قدیم عربوں کو ملامت کی گئی ہے. اور ہمیں تیمور کے یقین میں شک نہیں، مگر یہ کیا ہے کہ وہ چار ہزار زندہ انسانوں کو زمین میں دفن کر کے کم سے کم چار ہزار گھروں کو ماتم کدہ بنا دیتا ہے۔ اور اس کے جسم کا رواں تک نہیں کھڑا ہوتا۔ بدن میں جھرجھری نہیں ہوتی اور حضرت مجدد اسے بشارت جنت دے رہے ہیں گویا مرشدوں کے مقبروں کی دھول کی افشاں ہزار ہا انسانوں کے خون کا کفارہ ہو گئی۔

حضرت مجدد کے روحانی مقامات رفیعہ سے بحث کرنا ہمارے ایسے بے سوادوں کا کام نہیں، لیکن حضرت موصوف کا بھارت واسی اہلِ کتاب کے بارے میں جو موقف تھا، ماضی میں اس کی حیثیت جو بھی تھی، وہ دفتر لپٹ گیا۔ آج وہ نہ سیاسی طور پر درست ہے نہ مذہبی طور پر — کیونکہ اس موقف سے دو قومی نظریے کی تائید ہوتی ہے، نہ کہ مختلف الخیال

بھارتیوں کے باہم مل بیٹھنے کی۔

یک طرفہ بحث

فارسی کی مشہور کہاوت ہے۔ "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی"۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے کچھ اہلِ قلم، تاریخ نویسوں، مذہبی اصلاح کے مدعیوں اور میدان مناظرہ ومجادلہ کے شہسواروں کا ہے۔ اپنی ہی کہیں گے، مدمقابل کو موقع ہی نہ دیں گے کہ اس کی بات بھی سُن لی جائے یا دوسروں کو سنایا سنوادی جائے۔ اکثر وبیشتر پیرایۂ بیان ایسا اختیار کریں گے کہ لفظوں کا نقش مدمقابل کا ہو اور معنوی روح وہ ہوگی جو یہ حضرات اس میں پھونکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظوں کی جنگ تیر وتبر اور خنجر وشمشیر کی جنگ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور اس جنگ کا پہلا مقتول "حق" ہوتا ہے جس کے نام پر ذہنی زور آزمائی کا یہ دنگل سجایا گیا تھا۔

دو قومی نظریہ

پاکستانی فاضل مورّخ پروفیسر محمد اسلم صاحب کی کتاب "دینِ الٰہی" بھی کچھ اسی انداز کی کتاب ہے۔ پاکستان دو قومی نظریے کی اساس پر قائم ہوا تھا، یعنی یہ کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان الگ الگ دو قومیں ہیں اور اتنی مختلف ہیں کہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اسی بنا پر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان بٹ گیا۔ پاکستان کے نام سے جو حکومت وجود میں آئی دعویٰ کیا گیا کہ اس کی اساس "کتاب وسنّت" پر رکھی جائے گی، لیکن وہ آئین پچیس سال گزر جانے کے بعد بھی نہ بن سکا۔ کیونکہ پہلے ہی

طے نہ ہو سکا کہ (۱) کتاب اللہ کا کون سا مفہوم صحیح ہوگا۔ (۲) صحیح سنتِ رسول کس طرح، کس روایت سے تسلیم کی جائے گی۔ تفصیلات میں اجتہاد یا قیاس کس گزشتہ مدرسہ فکر یا مدارس فقہ کا مقبول ہوگا۔ اور اسلام کا صحیح نمایندہ کس مدرسہ خیال کو مانا جائے گا اور دوسرے مذاہب فکر کو اس میں چون وچرا کی گنجایش نہ ہوگی۔ اور گذشتہ چودہ سو برسوں کے ہر قسم کے تاریخی ریکارڈ اور مردان تاریخ آفریں میں سے کس کس کو سند یا مستند قرار دیا جائے گا۔ نئی مملکت (پاکستان) کی اکثریت کی ذہنیت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہی خدا کی چنی ہوئی قوم ہیں۔ اور ہندوستان میں روشنی ان کے دم سے تھی ورنہ یہ خطہ سدا سے تاریک رہا ہے اور ہندوستان کے اکابر سدا سے روشنی سے محروم رہے ہیں۔ ان کی کتابیں مہمل، ان کی اصطلاحیں غلط، ان کے بزرگ خورد، ان کا فلسفہ بے معنی، ان کی روحانیت اوہام وخرافات، وہ اپنے ملک اور اپنی جنم بھومی میں محکوم رہنے کے لیے بنائے گئے ہیں، اگرچہ اکثریت میں بھی ہوں۔ اور اس کے برخلاف پاکستان کے اجارہ دار علوم حکمت ومعرفت کے خزانچی اور امین، پاکستانی اسلام کے نمایندے۔ اگرچہ حالت یہ ہے کہ ایک بھائی دوسرے سے بیزار اور ایک دوسرے کی نام نہاد اسلامیت کا شکار جس سے تنگ آکر وہ تمام قانونی رشتے توڑ کر ایسے نام نہاد بھائی سے علیحدگی اور اپنی آزادی کا اعلان کردیتا ہے۔

حضرت مجدد کی دعوت

کتاب "دین الہٰی" کے چند بیانات پر سرسری گفتگو گزر چکی۔

اکبری دور کے مذہبی مورخ ملا بدایونی کی قسمیہ روایات کی حقیقت آپ کی نگاہوں سے گزر چکی۔ مگر دو یا تین باتیں رہی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ مقصود مناظرہ یا مجادلہ نہیں، حق کی تلاش ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے محترم پروفیسر محمد اسلم صاحب نے

"اکبر اور دین الہٰی کا مطالعہ صرف مجدد الف ثانی
کی تحریک کو سمجھنے کی خاطر کیا ہے۔ ان (مجدد صاحب)
کی تحریک چونکہ اکبر کی مذہبی حکمت عملی کا رد عمل ہے
اس لیے ان کی تحریک کو کما حقہ سمجھنے کے لیے اکبر
کے عمل کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔"

(دین الہٰی صلا)

آپ کروکشیتر کے حوض و مسجد و مندر کے قصے میں حضرت مجدد کا بیان موصوف ہی کے لفظوں میں پڑھ چکے ہیں، اب حضرت کے ایک اور مکتوب میں جو شیخ فرید کے نام ہے سکھوں کے گرو ارجن دیو کی شہادت کا ذکر ملاحظہ فرمائیے جو خسرو بیٹے اور جہانگیر باپ کی سیاسی رسہ کشی میں جہانگیر کے عتاب کا شکار ہوئے تھے۔ (شہادت کے وقت گرو صاحب گوندوال میں مقیم تھے) ارشاد ہے:

"دریں وقت کشتن کافر لعین گوبندوال بسیار خوب
واقع شد و باعث شکست عظیم بر ہنود مردود گشت۔
بہر نیت کہ کشتہ باشد۔ و بہر غرض کہ ہلاک کردہ۔ خواری کفار،
نقد وقت اہل اسلام است۔" (رود کوثر ہیج چہارم صلا۳۲۱)

یہ شیخ فرید ہی کو لکھتے ہیں کہ ہر شخص کی ایک دلی تمنا ہوتی ہے۔ میری بھی ایک دلی تمنا ہے کہ :

"ہر کسی را در دل تمنائے امریست از امور و تمنائے این فقیر (یعنی حضرت مجدد سرہندی) شدت نمودن است بدشمنان خدا و دشمنان پیغمبر و اہانت رسانیدن بایں بے دولتان و خوار داشتن ایشان و بہ یقین می داند کہ ہیچ عملی نزد حق عمل مرضی ترنیست۔"

(رود کوثر طبع چہارم ص ۳۱۹)

یہی شیخ فرید مخاطب ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا۔ اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں، بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے، کتوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہیے[1]۔ اور اگر دنیاوی غرض ان کے متعلق ہو جو اُن کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدنظر رکھ کر بقدر ضرورت

---

[1] رود کوثر کے اسی صفحے پر اس کا بھی تذکرہ ہے کہ آخر عمر میں حضرت مجدد کے طرز عمل میں ملائمت آگئی تھی۔ شہاب

ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے اور کمال اسلام
تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں
اور ان کی طرف نہ جائیں"

(رود کوثر طبع چہارم صفحہ ۳۲۰)

صاحب "رود کوثر" شیخ محمد اکرام صاحب اسی مجددی سرہندی تحریک کے متعلق اپنی کتاب رود کوثر کے صفحہ ۵۳۲ پر فرماتے ہیں کہ:

"سرہند سے ایک تحریک (یہی مجددی تحریک) اٹھی تھی۔ جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا۔ لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی، اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی، اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔

جارحانہ یا دفاعی تحریک

پروفیسر محمد اسلم صاحب اور محترم شیخ محمد اکرام صاحب مجددی تحریک کو ہندوؤں کی مذہبی بھگتی اور سیاسی جارحانہ احیائی تحریک کے خلاف ردعمل قرار دے کر اس کے جواز یا معذرت کی صورت تجویز کرتے ہیں (رود کوثر صفحہ ۳۲۳) میرے نزدیک یہ عذر ایک جذباتی معذرت ہو سکتا ہے، حقیقت کی کسوٹی پر معقول ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام میں مجددوں کا ظہور مسلم ہے اور

ہر صدی پر تجدید کی ضرورت ہے، تو ہندوؤں یا دوسرے مذاہب میں ان کے لیے مجددین و مصلحین کے ظہور کو کیوں کر شک وغیریت کی نظر سے دیکھا جائے جیسے مسلمانوں میں ہر قسم کی اصلاحی تحریکیں آئے دن اٹھتی رہتی ہیں ویسے ہی دوسرے اہل مذاہب میں مجددین و مصلحین کا ظہور قدرتی چیز ہے۔

رام اور رحمان

حضرت مجدد صاحب ہندوستان میں ظہور انبیاء و رسل کے قائل ہیں اور ہندو مذہبی کتابوں میں لفظ نبی، رسول، پیغمبر ڈھونڈنے والوں کو کہتے ہیں کہ یہ لفظ عربی اور فارسی کے ہیں، ہندو صحیفے سنسکرت میں ہیں۔ ان میں یہ لفظ تلاش نہ کرو بلکہ ان الفاظ کا مفہوم ادا کرنے والے دوسرے لفظ تلاش کرو اور ان کو سمجھو۔ یہ کچھ ماننے کے باوجود بھارت واسیوں کو اہل کتاب نہیں لکھتے۔ گویا خدا کا کافر کہتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے ہم معنی لفظوں میں سے ایک "رام" بھی ہے۔ آپ اسے "رحمان" کا قائم مقام ماننے سے منکر ہیں۔ ایک صوفی منش محترم ہندو ہردے رام نے حضرت مجدد کو خط لکھا جس میں نقرار و صوفیہ سے محبت و خلوص ظاہر کرنے کے بعد لکھا کہ رام اور رحمان کی حقیقت ایک ہی ہے۔ حضرت مجدد نے اسے بیوقوفی بتایا اور کہا کہ "خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا" (رود کوثر ۲۲۲)
یہ ایسی ہی غلطی ہے جیسے کوئی قرآن حکیم میں "علی العظیم" اور "علی الکبیر" پڑھ کر خیال کرے کہ قرآن میں "علی ابن ابی طالب کا نام کئی بار آیا ہے"۔ اس لیے جب اٹھتے بیٹھتے یا علی یا علی کہتا ہے تو وہ علی ابن ابی طالب سے استمداد کرتا ہے۔ تو ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ قرآن حکیم میں جس

"علی" کا نام بار بار دُہرایا گیا ہے وہ لم یلد ولم یولد ہے اور خالق ہے اور اس کے مقابلے میں علی ابن طالب مخلوق ہے۔ فاطمہ بنت اسد کا فرزند اور ابی طالب بن عبدالمطلب کا فرزند ہے۔ یہی حال رام کا ہے رام نام کا انسان کوشلیا ماں اور ایودھیا کے راجا دشرتھ باپ کا فرمانبردار بیٹا تھا اور سنسکرت میں خدائے لم یزل ولا یزال اور لم یلد ولم یولد کے اسمارِ حُسنیٰ میں سے ایک نام رام بھی ہے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں کہ:

My Rama, the Rama of our Prayers, is not the historical Rama, the son of Dasharatha, the king of Ayodhya. He is the eternal, the unborn, the one without a second. Him alone I worship, His aid alone I seek, and so should you. He belongs equally to all.

(Ramanama by M.K. Gandhi, P. 14).

رہی جارحانہ احیائی تحریک، وہ بھی حق بجانب تھی۔ بھارت واسیوں کو حق تھا اور ہر اس فرد اور ہر اس گروہ کو حق حاصل ہے کہ جنھیں ان کے وطن میں ان کے مذہب یا ذات کی وجہ سے کمتر سمجھا جاتا ہو۔ اور کوئی برسرِ اقتدار صاحبِ سیف حکومت رعایا کے کسی بھی حصّے کو کسی بھی خود پسندی کی بنا پر دبائے رکھنا چاہتی ہو۔ ایسے افراد اور جماعتوں کو حق حاصل ہے کہ ایسی غلط اندیش برسرِ اقتدار جماعت کو برطرف کر دینے کے تمام ممکن و معقول ذرایع سے کام لے۔

قرآن اور اہلِ کتاب سے خطاب

اب آپ اس نقطۂ نظر سے زیر تبصرہ زمانہ کے ہندوؤں کی مذہبی اور سیاسی احیائی جالرحانہ یا غیر جارحانہ تحریکوں کو دیکھیے اور اوپر کی سطروں میں حضرت مجدد صاحب کے بیانات پڑھیے اور غور کیجیے کہ کیا حضرت مجدد، اہل ملک کو صلح کل کا پیغام دے رہے تھے —— یا ہندو مسلمانوں میں بیگانگی اور نفرت کی دیوار کھڑی کر رہے تھے —— پاکستان کا ایک نوجوان پروفیسر تو ایسی کتاب لکھ سکتا ہے جیسی پیشِ نظر کتاب ہے۔ کیونکہ پاکستان کی بنیاد ہی تفریق اور دوئی پر رکھی گئی ہے۔ مگر ہندوستان میں رہنے والا اسلام اور قرآن کا نام لیوا اس خیال کو اپنے ذہن کے قریب لانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے یا اسے جاننا چاہیے کہ بھارت واسی اہلِ کتاب ہیں اور اہلِ کتاب سے گفتگو اور برتاؤ کے بارے میں اس کے سامنے قرآن حکیم کھلا پڑا ہے، جس میں ارشاد ہے:

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوٓا اٰمَنَّا بِالَّذِىْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(العنکبوت ۲۹/۴۶)

اور تم اہلِ کتاب کے ساتھ مہذب طریقے سے مباحثہ کرو، ہاں جو اُن میں زیادتی کریں[۱] اور یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جو ہم پر نازل ہوئی، اور اُن کتابوں پر بھی جو تم پر نازل ہوئیں اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو) کہ ہمارا اور

تمھارا معبود ایک ہے اور ہم تو اس
کی اطاعت کرتے ہیں۔
(ترجمہ از مولانا اشرف علی مرحوم)

آیت بالا کا ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی مرحوم کے مترجم قرآن سے ماخوذ ہے۔ اس کے ف۲ میں مولانا حاشیے میں لکھتے ہیں کہ

"یعنی ان کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کا مضائقہ نہیں، گو افضل جب بھی طریقۂ احسن ہے۔"

پنڈت ہردے رام مرحوم کی حضرت مجدد سے رام و رحمان کی بحث میں خط و کتابت کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے۔

"نقشۃ المصدّر اور ہندوستان کی شرعی حیثیت"

علامہ مولانا سعید احمد فاضل دیوبند ایم۔اے نے عنوان بالا سے ایک کتاب شایع فرمائی ہے۔ جس پر سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی ۲۵ کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۹ پر جناب ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کا دلچسپ اور مفید تبصرہ شایع ہوا ہے۔ اصل کتاب میں نے نہیں پڑھی۔ میں پیش نظر تبصرے کی بنا پر ذیل کی باتیں عرض کرنے کی جرارت کرتا ہوں:

بحث چلی آتی تھی کہ اسلامی نقشہ قدیم کی بنا پر ہندوستان کے

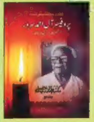
مسلمانوں کے لیے کیا پوزیشن ہے۔ قدیم فقہ نے دو دار ہی بتائے تھے۔ دار الحرب اور دارالاسلام۔ ہمارے ہندوستان کے مسلم علماء نے دو اور اصطلاحیں وضع فرمائیں۔ دار العہد اور دارالامان۔ ہمارے علامہ مولانا سعید احمد صاحب ایم اے اکبرآبادی نے پانچویں اصطلاح دار القوم کی وضع فرمائی ہے جس کی تفصیل فاضل ڈاکٹر مشیر الحق صاحب نے اپنے تبصرے کے آخر میں حسب ذیل تحریر فرمائی ہے:

> مولانا (سعید احمد) اکبرآبادی اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ موجودہ سیکولر ہندوستان کو کیا کہا جائے گا؟ جواب (از مولانا سعید احمد) یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو دارالاسلام ہے نہ دارالحرب، نہ ہی دارالعہد ہے اور نہ دارالامان، بلکہ ہندوستان ایک پانچویں قسم کا دار ہے، جسے ہم دارالقوم -nati onal state کہہ سکتے ہیں۔ "یہاں صورت حال یہ ہے کہ سب ہندوستانی مذہبا اور زبان اور رنگ اور نسل کے اختلافات کے باوجود دستوری اور آئینی طور پر ایک قوم (nation) ہیں اور مسلمان بھی اس کا ایک جزو ہیں۔ چنانچہ پاسپورٹ۔ ویزا۔ شہری حقوق۔ قومی اور بین الاقوامی

معاملات و مسائل۔ ان سب امور میں ان (مسلمانوں)
کے ساتھ جو معاملہ یا برتاؤ ہوتا ہے وہ ہندوستانی
قومیت کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے۔ ان (مسلمانوں)
کی یہ وہ حیثیت ہے جس کو خود انھوں نے تسلیم
کیا ہے اور انٹرنیشنل لا کے ماتحت دنیا کی سب
مسلم اور غیر مسلم حکومتوں اور قوموں نے کیا ہے۔
اس بنا پر ہندوستان کسی ایک مذہب یا گروہ کا
نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا وطن (وار) ہے جو
انڈین نیشنلٹی رکھتے اور انڈین نیشن کا جزو ہیں"۔
(اسلام اور عصر جدید۔ دہلی ۱۹۷۰ء)

ہندوستانی قومیت کی بنیاد وطنیت پر ہے۔ مذہب کے بدل جانے سے وطنیت نہیں بدل جاتی۔ ایک ہندوستانی خدا رسیدگی کے لیے کوئی طریق بندگی بھی اختیار کر سکتا ہے اگر جب تک وہ ہندوستانی آئین و قانون کا پابند ہے، اس کے حقوق و فرائض وہی ہیں جو دوسرے ہندوستانیوں کے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ —— اب سیاست اکبری اور روش مجددی اور موجودہ سیاسی موقف آئین ہند کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس کو کیا سمجھنا چاہیے۔

پروفیسر آل احمد سرور



مرتبہ : خلیق انجم

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

ایک چادر میلی سی



مصنف : راجندر سنگھ بیدی

صفحات : 116

قیمت : -/48 روپے

انارکلی



مصنف : امتیاز علی تاج

صفحات : 184

قیمت : -/60 روپے

عبارت کیسے لکھیں

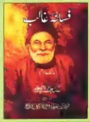


مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

فسانۂ غالب



مصنف : مالک رام

صفحات : 192

قیمت : -/72 روپے

آزمائش کی گھڑی

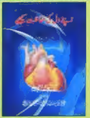


مصنف : سید حامد

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے



ترجمہ : نذیر الدین مینائی

صفحات : 84

قیمت : -/48 روپے

فردوس بریں



مصنف : شرر لکھنوی

صفحات : 180

قیمت : -/60 روپے

ISBN: 978-81-7587-802-0

9 788175 878020

₹ 66/-